پاکستان میں نظامِ خلافت : کیا، کیوں اور کیسے؟

کے موضوع پر امیر تنظیم اسلامی و داعی تحریک خلافت پاکستان

ڈاکٹر اسرار احمد

کی چار تحریریں اور ایک تقریر یکجا کتابی صورت میں شائع کر دی گئی ہیں!

تحریریں:

(1) ۹۱ء میں اجرائے تحریک کے موقع پر پریس کانفرنس میں بیان!

(2) عہد حاضر میں اسلامی ریاست یا نظام خلافت کا دستوری خاکہ!

(3) اسلامی ریاست یا نظام خلافت میں سیاسی جماعتوں کا کردار!

(4) پاکستان کی قومی سیاست میں مذہبی جماعتوں کا کردار!

تقریر:

پاکستان میں نظام خلافت' امکانات' خدوخال اور اس کے قیام کا طریق کار

☆ کتابی سائز ☆ صفحات 96 ☆ سفید کاغذ ☆ دیدہ زیب ٹائٹل

قیمت : 30 روپے

وَمَنْ یُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِیَ خَیْرًا كَثِیْرًا

(البقرۃ: ۲۶۹)

ماهنامه

حکمتِ قرآن

لاهور

بیادگار، ڈاکٹر محمد رفیع الدین، ایم اے، پی ایچ ڈی، ڈی لٹ، مرحوم

مدیر اعزازی: ڈاکٹر ابصار احمد، ایم اے، ایم فل، پی ایچ ڈی

نائب مدیر: حافظ عاکف سعید، ایم اے (فلسفہ)

معاون: حافظ خالد محمود خضر، ایم ایس سی

جلد ۲۰ | صفر المظفر ۱۴۲۲ھ — مئی ۲۰۰۱ء | شمارہ ۵

— یکے از مطبوعات —

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

۳۶۔کے۔ماڈل ٹاؤن۔لاہور ۱۴۔ فون: ۵۸۶۹۵۰۱

کراچی آفس: داؤد منزل متصل شادی ہجری، شاہراہ لیاقت کراچی فون: ۲۱۶۵۸۶

سالانہ زرِ تعاون -/۸۰ روپے، فی شمارہ -/۸ روپے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حرفِ اوّل

زیرِنظر شمارے میں ڈاکٹر محمد امجد تھانوی کا مضمون ''علماءِ دیوبند کی دینی خدمات'' بطورِ خاص شامل کیا گیا ہے کہ گزشتہ ماہ پشاور میں ''ڈیڑھ سو سالہ خدماتِ دارالعلوم دیوبند کانفرنس'' کے عنوان سے ایک عظیم الشان اجتماع کا انعقاد ہوا، جس میں اندرون و بیرونِ ملک سے بلامبالغہ لاکھوں افراد نے شرکت کی۔ یہ کانفرنس پاکستان میں علماءِ دیوبند کی ایک نمایاں شاخ ''جمعیت علماءِ اسلام (ف)'' کے زیرِاہتمام منعقد ہوئی اور اس کے ذریعے پاکستان بالخصوص صوبہ سرحد و بلوچستان کی پختون بیلٹ میں علماءِ دیوبند کی اثر انگیزی کا ایک بین ثبوت فراہم ہوا۔ یہی وہ خطۂ زمین ہے جس میں واقع دیوبندی مدارس سے طالبانِ افغانستان نے دینی تعلیم کی تحصیل کی اور اب وہ پوری دنیا کی مخالفت مول لے کر افغانستان کی سرزمین پر اللہ کے دین کے قیام اور اس کی شریعت کے نفاذ کے لیے سرگرمِ عمل ہیں۔

یہ امر واقعہ ہے کہ دیوبند کسی ایک دارالعلوم کا نہیں، تحریک کا نام ہے۔ کس کو خبر تھی کہ ڈیڑھ سو سال قبل ایک مسجد کے صحن میں انار کے ایک درخت کے سائے تلے ایک طالب علم اور ایک استاد سے شروع ہونے والا یہ چھوٹا سا دینی مدرسہ ایک عالمگیر تحریک کا نقطۂ آغاز بن جائے گا۔ ہمارے نزدیک دارالعلوم دیوبند کو اگر بارہویں صدی ہجری کے مجددِ اعظم شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی برپا کی ہوئی رجوع الی القرآن تحریک کا معنوی تسلسل اور ان کے انقلاب آفریں افکار کا وارث قرار دیا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ اس کی آبیاری میں شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ کی ہمہ جہت کاوشوں کو بلاشبہ غیر معمولی دخل حاصل ہے، جنہیں مرکزی انجمن کے صدر مؤسس محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب چودھویں صدی کے مجددِ اعظم قرار دیتے ہیں۔ شیخ الہندؒ کے ترجمۂ قرآن جس پر حواشی کا بڑا حصہ شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانیؒ کا مرتب کردہ ہے، قرآن کے مفہوم و مدلول کی وضاحت کے ضمن میں ایک کلید کی حیثیت رکھتا ہے۔ شیخ الہندؒ نے امت کے زوال کے اسباب میں سے اہم ترین سبب قرآن سے دوری کو قرار دیا تھا اور اس کے علاج کے طور پر عوامی درسِ قرآن کے انعقاد پر خصوصی زور دیا تھا۔ بحمد اللہ مرکزی انجمن خدام القرآن حضرت شیخ الہند کی تشخیص کے مطابق امت کے علاج کے لیے سرگرمِ عمل ہے کہ حکیم الامت علامہ اقبال کی تشخیص بھی یہی تھی کہ ؎

وہ زمانے میں معزز تھے مسلماں ہوکر
اور تم خوار ہوئے تارکِ قرآں ہوکر!

درس ۱۹

اِعراض عن الجہاد کی پاداش

نفاق

سورۃُ المنافقون کی روشنی میں

(۱)

نفاق کی حقیقت' اس کا سبب اور اس کے درجات

سورۃ الصف اور سورۃ الجمعہ کے بعد مطالعہ قرآن حکیم کے ہمارے اس منتخب نصاب کے حصہ چہارم کا آخری درس سورۃ المنافقون پر مشتمل ہے۔ حسنِ اتفاق سے زیرِ نظر منتخب نصاب میں بھی یہ سورتیں اسی ترتیب سے شامل کی گئی ہیں جس ترتیب سے یہ مصحف میں وارد ہوئی ہیں' یعنی پہلے سورۃ الصف' پھر سورۃ الجمعہ اور پھر سورۃ المنافقون۔ اس ترتیب میں بڑی معنویت پنہاں ہے' اس لئے کہ نفاق درحقیقت نتیجہ ہے جہاد فی سبیل اللہ سے کنی کترانے اور اس سے دامن بچانے کا۔ یہی وجہ ہے کہ نفاق کی حقیقت' اس کا اصل سبب' اس کا نقطۂ آغاز' اس کی علامات' اس کے مدارج و مراتب' اس کی ہلاکت خیزی اور اس کے ساتھ ساتھ اس سے بچنے کی تدابیر' بلکہ کہیں اگر اس کی چھوت لگ گئی ہو تو اس کے علاج اور معالجے کی تدابیر' ان بہت سے موضوعات پر مشتمل یہ سورت مصحف میں بھی سورۃ الصف اور سورۃ الجمعہ کے بعد وارد ہوئی ہے اور ہمارے اس منتخب نصاب میں بھی یہ تینوں سورتیں اسی ترتیب سے شامل ہیں۔

منافقین کی دو قسمیں

اس سے پہلے کہ سورۃ المنافقون کی آیات کا سلسلہ وار مطالعہ شروع کیا جائے' مناسب ہوگا کہ پہلے اصولاً یہ سمجھ لیا جائے کہ نفاق اصل میں ہے کیا! گویا کہ اب چند باتیں حقیقت نفاق سے متعلق عرض کی جائیں گی۔

نفاق کے بارے میں یہ بات تو معلوم اور معروف ہے کہ منافق اسے کہتے ہیں جس کے دل میں ایمان نہ ہو لیکن وہ ایمان کا مدّعی اور ایمان کا دعوے دار ہو' گویا وہ اپنے آپ کو مسلمانوں میں شامل کراتا ہو' حالانکہ اس کا دل نورِ ایمان سے خالی ہو۔ یہ بات یقیناً صحیح ہے' لیکن اس کے بارے میں یہ عام تصوّر جو لوگوں میں پایا جاتا ہے کہ منافق صرف وہی ہوتا ہے کہ جو ابتداء ہی سے دھوکہ اور فریب کی نیت کے ساتھ اسلام میں داخل ہو' گویا کہ اسے کبھی ایمان کی کوئی رمق سرے سے نصیب ہی نہ ہوئی ہو' یہ بات پورے طور پر درست نہیں ہے۔ اس نوع کے منافق بھی یقیناً پائے جاتے تھے لیکن ایسا معاملہ بہت کم تھا۔ قرآن مجید میں یہود کی ایک سازش کا ذکر ہے کہ جب ان کی ساری مخالفتوں کے علی الرغم اور تمام تر ریشہ دوانیوں اور سازشوں کے باوجود مدینے میں اسلام کی جڑیں گہری ہوتی چلی گئیں اور نبی اکرم ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے مدینہ منورہ میں تمکّن عطا فرما دیا تو انہوں نے اسلام کی قوّت کو کمزور کرنے کے لئے ایک تدبیر سوچی۔ انہوں نے دیکھا کہ اسلام کی یہ ساکھ عرب معاشرے میں قائم ہو چکی ہے کہ جو شخص ایک بار ایمان لے آتا ہے وہ واپس نہیں پھرتا' چاہے ایمان قبول کرنے کے نتیجے میں اسے کتنی ہی تکلیفیں برداشت کرنی پڑیں اور کیسی ہی مصیبتیں جھیلنی پڑیں۔ اس ساکھ کو ختم کرنے کے لئے انہوں نے یہ سازش تیار کی کہ صبح کے وقت ایمان لانے کا اعلان کرو اور شام کو انکار کر دو اور مرتد ہو جاؤ' اپنے سابق دین میں واپسی کا اعلان کر دو۔ اس طرح امید کی جا سکتی ہے کہ کچھ اور لوگ بھی لوٹ آئیں' اپنے آبائی دین کی طرف پلٹ آئیں۔ عام لوگ یہ سوچنے پر مجبور ہوں گے کہ آخر یہ لوگ دائرۂ اسلام میں داخل ہوئے تھے' اندر جا کر انہوں نے ضرور کوئی ایسی غیر متوقع بات دیکھی ہو گی جس سے بدک کر یہ لوگ واپس لوٹ آئے' ممکن ہے جس اُمید میں یہ اسلام میں گئے تھے اس کے

برعکس کوئی صورت وہاں نظر آئی ہو کہ انہیں لوٹنا پڑا!..... ایمان کی ساکھ کو ختم کرنے کے لئے یہود نے یہ تدبیر اختیار کی۔ اب ظاہر بات ہے کہ اس کیفیت کے ساتھ جو شخص بھی اسلام کے دائرے میں داخل ہوا اس نے اگرچہ کلمہ شہادت زبان سے ادا کیا ہوگا لیکن اس کا یہ داخلہ ابتداء ہی سے دھوکے کے تحت ہے' ایمان کی کوئی رمق اسے کسی ایک لمحے کیلئے بھی حاصل نہیں ہوئی۔ ایسے کسی شخص نے ایک آدھا دن یا چند دن اگر اس قانونی اسلام کی کیفیت میں بسر کئے تو یقیناً ایک خالص منافق کی حیثیت سے بسر کئے ہیں۔

اس نوع کا معاملہ بعد میں بھی ہوسکتا ہے کہ کوئی شخص مسلمانوں میں جاسوس کی حیثیت سے شامل ہونے کے لئے اسی قسم کے کسی انداز میں اسلام میں داخل ہو' اور کلمۂ شہادت زبان سے ادا کرے تو ایمان سے یکسر محروم ہونے کے باوجود بھی قانونی طور پر وہ مسلمان سمجھا جائے گا۔ اور ایسا شخص تو ظاہر بات ہے کہ شعائرِ دینی کا احترام بھی عام مسلمان سے زیادہ کرے گا' اپنے آپ کو مسلمان منوانے کے لئے وہ نمازیں بھی پڑھے گا' روزے بھی رکھے گا' لیکن اس شخص کے قلب کی کیفیت کے بارے میں ہر شخص جانتا ہے کہ ایک لحظہ کے لئے بھی اسے کبھی ایمان کی روشنی نصیب نہیں ہوئی۔ تو اگرچہ اس نوع کا نفاق بھی دورِ نبویؐ میں موجود تھا لیکن اکثر و بیشتر جس قسم کے نفاق کا ذکر ہمیں قرآن مجید میں ملتا ہے اس کی نوعیت اس سے مختلف تھی۔

نفاق کا اصل سبب

اس نفاق کی اصل حقیقت کو سمجھنے کے لئے جو دورِ نبویؐ میں بالعموم پایا جاتا تھا اور جس کا قرآن حکیم میں کثرت سے ذکر ملتا ہے' یہ بات پیش نظر رکھئے کہ انسان اپنی قوتِ ارادی کے اعتبار سے مختلف کیفیات اور مختلف درجوں کے ہوتے ہیں۔ ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جو کسی نظریئے یا مسلک کو ہر چہ باداباد کی سی شان کے ساتھ قبول کرتے ہیں ع ہر چہ باداباد ما کشتی در آب انداختیم

کہ ہم نے کشتی دریا میں ڈال دی ہے اب جو ہو سو ہو۔ طارق بن زیادؒ نے جس کی انتہائی مثال قائم کی کہ ع

طارق چو بر کنارۂ اندلس سفینہ سوخت

ساحل اندلس پر پہنچ کر کشتیاں جلا ڈالیں کہ واپسی کا دھیان بھی کبھی نہ آئے۔ اس مزاج کے حامل لوگ ہر دَور میں دُنیا میں موجود رہے ہیں' کبھی کم اور کبھی زیادہ' لیکن ایک دوسرے مزاج کے لوگ بھی دنیا میں رہے ہیں اور ہمیشہ رہیں گے جنہیں ہم کمزور طبائع کے حامل لوگ یا ضعیف قوّتِ ارادی کے مالک لوگ قرار دیتے ہیں کہ ایک خاص راستے پر چلنا چاہتے ہیں' لیکن اپنی کم ہمتی کے باعث چل نہیں پاتے۔ اس راہ میں درپیش مشکلات وموانع اور سختیوں اور آزمائشوں کے مقابلے میں قدم قدم پر ان کی ہمتیں جواب دیتی نظر آتی ہیں' ان کا جوشِ عمل سرد پڑتا ہے' وہ آگے بڑھنے کے بجائے کسی ایک مقام پر کھڑے کے کھڑے رہ جاتے ہیں یا کبھی لوٹنے کے ارادے سے چند قدم پیچھے ہٹتے ہیں تو پھر اگر کوئی آسان صورت حال سامنے آئے تو دو چار قدم آگے بڑھا لیتے ہیں' حالات کی سختی اگر برقرار رہے تو بالآخران میں سے بعض کے قدم پیچھے ہی ہٹتے چلے جاتے ہیں۔ یہ دونوں طبائع ہمیشہ پائی گئی ہیں اور آئندہ بھی پائی جائیں گی۔

یہ بات ذہن میں رکھئے کہ مکی دَور میں جو لوگ ایمان لائے ان کی غالب اکثریت ان لوگوں پر مشتمل تھی جو اسلام اور پیغمبر اسلام ﷺ کی حقّانیت کو پوری طرح قلبی و ذہنی طور پر تسلیم کرنے کے بعد ایمان لائے تھے۔ کلمہ شہادت زبان سے ادا کرنے سے پہلے ہی وہ ہر مصیبت کو جھیلنے کے لئے آمادہ اور ہر قربانی دینے کے لئے تیار ہو چکے ہوتے تھے۔ اس لئے کہ انہیں معلوم تھا کہ اِدھر ہم نے یہ الفاظ زبان سے نکالے اُدھر مصیبتوں کے پہاڑ ہم پر ٹوٹ پڑیں گے' گھر میں اور گھر کے باہر ہر جگہ مشکلات' تکالیف اور تشدّد (persecution) کا سامنا ہوگا' لہٰذا جو آتا خوب سوچ سمجھ کر اسلام کی طرف آتا۔ لیکن یہ صورتِ حال بعد میں برقرار نہ رہی۔ مدنی دَور کے ابتدائی دو ایک سال کے بعد حالات تیزی سے بدلنے لگے۔ مدینہ منورہ میں اللہ تعالیٰ نے نبی اکرم ﷺ کو تمکّن فی الارض یعنی غلبہ عطا فرما دیا' اوس اور خزرج ہی مدینہ کے دو بڑے قبیلے تھے' دونوں ایمان لے آئے' گویا آپؐ مدینہ منورہ کے بے تاج بادشاہ ہو گئے۔ اب یہ بات نہیں رہی کہ جو ایمان لائے اس کو شدائد اور مصائب سے سابقہ پیش آتا ہو' لہٰذا کچھ کمزور طبائع نے بھی ہمت کی اور حالات کو سازگار دیکھتے ہوئے اسلام قبول کر لیا۔

واضح رہے کہ یہ لوگ بھی اسلام کی دعوت سے متاثر ہو کر دائرۂ اسلام میں داخل ہوئے تھے' ان کے دل نے بھی یہ گواہی دی ہوگی کہ قرآن اللہ کا کلام ہے اور اس کی تعلیمات انسانی فطرت کی شہادتوں سے ہم آہنگ ہیں' اس لئے کہ اللہ پر ایمان لانا اور اس کی توحید کا اقرار کرنا فطرتِ انسانی میں شامل ہے۔ اسی طور پر فطرتِ انسانی اس بات کا بھی تقاضا کرتی ہے اور عقل اس حقیقت کو قبول کرتی ہے کہ اعمالِ انسانی کے بھرپور نتائج نکلنے چاہئیں' میزانِ عدل نصب ہونی چاہئے اور اس کے مطابق جزا و سزا ہونی چاہئے۔ حشر و نشر اور جنت و دوزخ ان سب حقیقتوں کو ذہن قبول کرتا ہے۔ اسی طرح نبی اکرم ﷺ کی سیرت و کردار اور ایک خورشید تاباں و درخشاں کی مانند آپؐ کی شخصیت بھی لوگوں کے سامنے تھی اور آپؐ کی حقانیت کی گواہی بھی لوگوں کے دل کی گہرائیوں سے پھوٹتی تھی' چنانچہ لوگ آئے' ایمان قبول کرلیا۔ لیکن جیسے جیسے ایمان کے عملی تقاضے سامنے آنے لگے' جان اور مال کھپانے کے مطالبے شدت پکڑنے لگے تو ضعیف الارادہ اور کم ہمت لوگوں کے لئے اسلام اور ایمان کے راستے پر چلنا مشکل ہوتا گیا۔ سورۃ الصف کی آخری آیت ذہن میں لائیے! اللہ کے دین کے غلبے کے لئے نبی اکرم ﷺ کی نصرت کا مطالبہ کس زوردار انداز میں آیا ہے:

﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْٓا اَنْصَارَ اللّٰهِ كَمَا قَالَ عِیْسَى ابْنُ مَرْیَمَ لِلْحَوَارِیّٖنَ مَنْ اَنْصَارِیْٓ اِلَى اللّٰهِ ؕ﴾

اللہ کی راہ میں جان و مال کھپانے کے پُرزور مطالبے پر مبنی سورۃ الصف کی آیات ۱۰ اور ۱۱ کو بھی ذہن میں لائیے:

﴿هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰى تِجَارَةٍ تُنْجِیْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِیْمٍ ۝ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَتُجَاهِدُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ ؕ﴾

اور پیچھے چلئے' سورۃ الحجرات کی آیت ۱۵ ہم پڑھ آئے ہیں جس میں جہاد فی سبیل اللہ کو ایمان کا لازمی تقاضا قرار دیا گیا:

﴿اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ لَمْ یَرْتَابُوْا وَجٰهَدُوْا

بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ ؕ اُولٰٓئِکَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ ۝﴾

یہ تقاضے نہایت کٹھن ہیں' جان اور مال دونوں انسان کو بہت عزیز ہیں' بلکہ بسا اوقات انسان کا مزاج یہ بن جاتا ہے کہ جان چلی جائے' مال نہ جائے۔ چنانچہ ایسے کمزور طبائع کے حامل لوگوں کو دنیا اور اس کی آسائشیں چھوڑ کر جہاد و قتال کے راستے پر جانا بہت دشوار معلوم ہوتا' بقول جگر مرادآبادی:

تپتی راہیں مجھ کو پکاریں
دامن پکڑے چھاؤں گھنیری

دو بلیغ تمثیلیں

ایسے لوگوں کے لئے سورۃ الحج میں بڑی پیاری تشبیہ وارد ہوئی ہے۔ فرمایا: ﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنْ یَّعْبُدُ اللّٰهَ عَلٰی حَرْفٍ﴾ کہ لوگوں میں سے کچھ ایسے بھی ہیں جو کنارے رہ کر اللہ کی بندگی کرنا چاہتے ہیں۔ ایک وہ ہے جو ہر چہ باداباد کا نعرہ لگا کر منجدھار میں کودنے کے لئے آمادہ ہے اور ایک وہ ہے جو کنارے کنارے چلنا چاہتا ہے' اپنی جان اور مال کو بچا بچا کر رکھنا چاہتا ہے' اگرچہ ؎

آسودۂ ساحل تو ہے مگر شاید یہ تجھے معلوم نہیں
ساحل سے بھی موجیں اٹھتی ہیں خاموش بھی طوفاں ہوتے ہیں

کے مصداق کنارے پر بھی انسان پر کوئی مصیبت آ سکتی ہے۔ لیکن بہرحال منجدھار کے مقابلے میں دریا کا کنارہ آرام و آسائش اور عافیت کا ایک گوشہ ہے۔ اسی مضمون کو آگے بڑھاتے ہوئے فرمایا: ﴿فَاِنْ اَصَابَهٗ خَیْرُ ِ اطْمَاَنَّ بِهٖ﴾ کہ اگر اسے خیر پہنچتا رہے' سہولتیں میسر رہیں تو مطمئن رہتا ہے ﴿وَاِنْ اَصَابَتْهُ فِتْنَةُ ِ الْقَلَبَ عَلٰی وَجْهِهٖ﴾ اور اگر کوئی آزمائش آ پڑی' کوئی کٹھن مرحلہ درپیش ہوا یا جان اور مال کے لگانے کا کوئی تقاضا سامنے آیا تو پھر وہ اوندھے منہ گر کر رہ جاتا ہے۔ فرمایا: ﴿خَسِرَ الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَةَ﴾ یہ دنیا اور آخرت دونوں کا خسارہ ہے۔ ایسے شخص کی دنیا بھی برباد ہوئی اور آخرت بھی۔ ﴿ذٰلِکَ هُوَ الْخُسْرَانُ الْمُبِیْنُ ۝﴾ یہ ہے واضح اور صریح خسارہ۔

یہی مضمون سورۃ البقرۃ کے دوسرے رکوع میں بھی آیا ہے۔ وہاں تین قسم کے

انسانوں کا ذکر ہوا ہے۔ ایک وہ متقی اور خدا ترس لوگ جو قرآن حکیم سے صحیح طور پر استفادہ کرنے کے اہل ہیں۔ دوسرے وہ لوگ جن کی مسلسل ہٹ دھرمی اور ضد کے باعث ان کے دلوں پر مہریں لگ چکی ہیں اور قرآن کی ہدایت اب ان کے حق میں قطعاً مفید نہیں۔ تیسرا طبقہ ان دونوں کے بین بین ہے۔ آیت ۸ میں ان کا تذکرہ ہے:
﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ ۝﴾ کہ کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو مدّعی ہیں اس بات کے کہ ہم ایمان لے آئے اللہ پر اور یوم آخر پر درانحالیکہ وہ فی الواقع مؤمن نہیں ہیں۔ ذرا آگے چل کر اسی دوسرے رکوع میں ان کے لئے ایک تمثیل بیان کی گئی:

﴿اَوْ كَصَيِّبٍ مِّنَ السَّمَآءِ فِيْهِ ظُلُمٰتٌ وَّرَعْدٌ وَّبَرْقٌ ۚ يَجْعَلُوْنَ اَصَابِعَهُمْ فِيْٓ اٰذَانِهِمْ مِّنَ الصَّوَاعِقِ حَذَرَ الْمَوْتِ ۭ وَاللّٰهُ مُحِيْطٌۢ بِالْكٰفِرِيْنَ ۝ يَكَادُ الْبَرْقُ يَخْطَفُ اَبْصَارَهُمْ ۭ كُلَّمَآ اَضَاۗءَ لَهُمْ مَّشَوْا فِيْهِ ۙ وَاِذَآ اَظْلَمَ عَلَيْهِمْ قَامُوْا ۭ وَلَوْ شَاۗءَ اللّٰهُ لَذَهَبَ بِسَمْعِهِمْ وَاَبْصَارِهِمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝﴾

یہ ایک مرکب تمثیل ہے۔ رات کا وقت ہے' موسلا دھار بارش ہو رہی ہے' بادلوں کی گھن گرج اور بجلی کی کڑک اور چمک نے ماحول کو ہیبت ناک بنا دیا ہے' کچھ کم ہمت اور بزدل لوگ اس طوفان میں گھرے ہوئے ہیں۔ کڑک سے ان کی جان نکلی جا رہی ہے۔ اپنے کانوں میں انگلیاں ٹھونسے ہوئے وہ خوف و دہشت کی تصویر بنے کھڑے ہیں۔ جیسے ہی بجلی کی چمک سے ماحول تھوڑی دیر کے لئے منور ہوتا ہے تو وہ ہمت کر کے دو چار قدم آگے بڑھ جاتے ہیں۔ اور جب ماحول پھر تاریک ہو جاتا ہے تو کھڑے کے کھڑے رہ جاتے ہیں۔

نفاق کا آغاز

اس تمثیل میں ایک خاص انسانی کردار کا مکمل نقشہ موجود ہے۔ حالات سازگار اور موافق ہوئے تو ایمان اور اسلام کے راستے پر چلتے رہے' لیکن جب آزمائش کا وقت آیا' جہاد اور قتال فی سبیل اللہ کی کڑک اور گھن گرج سنائی دی' جان و مال کے ایثار

کا کٹھن مطالبہ سامنے آیا تو ٹھٹھک کر کھڑے ہو گئے' کمرِ ہمت ٹوٹ کر رہ گئی۔ یہ کیفیت درحقیقت مرضِ نفاق کا آغاز ہے۔ یہ اس مہلک مرض کا starting point ہے۔ البتہ یہ بات سمجھ لینی چاہئے کہ اس کیفیت کے ابتدائی مراحل کو قرآن نفاق قرار نہیں دیتا۔ نفاق سے پہلے ایک منزل ضعف ایمان کی ہے کہ ایمان ابھی اس درجے پختہ نہیں ہوا کہ انسان کا عمل پورے طور پر اس کے تابع ہو سکے۔ چنانچہ عمل میں بھی کمی اور کوتاہی کا صدور ہوتا رہتا ہے' لیکن ضعفِ ایمانی کی اس کیفیت کا یہ ایک لازمی امر ہے کہ انسان اپنی خطا کا اعتراف کرتا ہے' جھوٹے بہانے نہیں بناتا بلکہ اپنی غلطی اور کوتاہی کو صاف تسلیم کر لیتا ہے' اللہ تعالیٰ سے معافی کا خواستگار ہوتا ہے' نبی ﷺ سے بھی معذرت کرتا ہے اور استدعا کرتا ہے کہ میرے لئے اللہ سے استغفار کیجئے۔ جب تک یہ صورت برقرار رہے اسے نفاق نہیں کہا جائے گا بلکہ اسے ضعفِ ایمان سے تعبیر کیا جائے گا۔ لیکن اس سے اگلا قدم یہ ہے کہ انسان اپنی کمزوریوں پر پردے ڈالنے لگے' جھوٹے بہانوں کو اپنی بے عملی کے لئے آڑ اور ڈھال کے طور پر استعمال کرنے لگے' تو یہاں سے یوں سمجھئے کہ نفاق کی سرحد شروع ہو گئی' مرضِ نفاق کے پہلے مرحلے کا آغاز ہو گیا۔

نفاق ایک روگ ہے

جس طرح یہ بات عام طور پر معروف ہے کہ ٹی بی کی تین stages ہوتی ہیں' اسی طرح یہ جان لیجئے کہ مرضِ نفاق کے بھی تین درجے یا تین مرحلے ہیں۔ اور یہ عجیب بات ہے کہ قرآن مجید نے نفاق کو بھی ایک روگ اور مرض قرار دیا ہے۔ سورۃ البقرۃ کے دوسرے رکوع میں فرمایا: ﴿فِیْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ فَزَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضًا﴾ ''ان کے دلوں میں ایک روگ ہے' پس اللہ نے اس روگ میں اضافہ فرما دیا'' ——— اور یہ اللہ تعالیٰ کی مستقل سنت اور طے شدہ ضابطہ ہے کہ اگر تم ہدایت کی طرف آؤ گے تو تمہاری ہدایت میں اضافہ ہوتا چلا جائے گا اور اگر گمراہی کا راستہ اختیار کرو گے تو گمراہی اور ضلالت کے راستے کھلتے چلے جائیں گے۔ بے حیائی کی طرف اگر تم رخ کرو گے تو بے حیائی کے کاموں میں بڑھتے چلے جاؤ گے۔ جن گھرانوں کے بارے میں آج

سے پچاس سال پہلے یہ تصور نہیں ہوسکتا تھا کہ ان کی خواتین کی کوئی جھلک کبھی کوئی دیکھ پائے گا' جو حفیظ کے اس شعر کا مصداق کامل تھیں کہ ع

چشمِ فلک نے آج تک دیکھی نہ تھی ان کی جھلک

اب انہی گھرانوں کی بیٹیاں اور پوتیاں قریباً نیم عریاں لباس میں سڑکوں پر چلتی پھرتی نظر آتی ہیں۔ یہ سب کچھ تدریجاً ہوا ہے۔ ایک برائی اگلی دس برائیوں کی راہ ہموار کرتی ہے۔ تو اللہ کی سنت اور اس کا دستور یہی ہے کہ ہدایت کی طرف آؤ گے تو وہ اس کے راستے کھول دے گا (فَسَنُيَسِّرُهُ لِلْيُسْرٰى) برائی کی طرف جاؤ گے' بے حیائی کا راستہ اختیار کرو گے تو اس میں آگے بڑھتے چلے جاؤ گے' اللہ تعالیٰ اس راستے کو تمہارے لئے آسان بنا دیں گے (فَسَنُيَسِّرُهُ لِلْعُسْرٰى) اسی طرح اگر نفاق کا راستہ اختیار کرو گے تو اسی راہ میں بڑھتے چلے جاؤ گے۔ یہی وہ حقیقت ہے جس کا ذکر اس آیت مبارکہ میں ہے: ﴿فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ فَزَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضًا﴾

مرضِ نفاق کے تین درجے

تو آیئے کہ اب ہم دیکھیں کہ نفاق کے تین درجات کون کون سے ہیں۔ پہلا درجہ یا پہلی stage یہ ہے کہ انسان اپنی عملی کوتاہی اور غلط روی پر پردہ ڈالنے کے لئے جھوٹ کا سہارا لینا شروع کر دے۔ حدیثِ نبویؐ میں بھی منافق کی نشانیوں میں جھوٹ کا بطور خاص ذکر ملتا ہے۔ فرمایا: ((آيَةُ الْمُنَافِقِ ثَلَاثٌ)) ''منافق کی تین نشانیاں ہیں'' اور پہلی نشانی آپؐ نے یہ بیان فرمائی: ((اِذَا حَدَّثَ كَذَبَ)) کہ جب بولے جھوٹ بولے۔ یہ اس کی نمایاں ترین علامت ہے۔ تو جھوٹ بول کر اور جھوٹے بہانوں کے ذریعے اپنی کوتاہی اور اپنی تقصیر پر پردہ ڈالنے کی کوشش کرنا مرضِ نفاق کا اوّلین درجہ ہے۔

پھر اس کذب بیانی اور دروغ گوئی میں جب جھوٹی قسموں کا اضافہ ہوتا ہے تو اب گویا یہ اس مرض کے اگلے مرحلے کا آغاز ہے۔ سورۃ المنافقون میں آپ دیکھیں گے کہ اسی مضمون سے سورۃ کا آغاز ہوا ہے: ﴿اِذَا جَآءَكَ الْمُنٰفِقُوْنَ قَالُوْا نَشْهَدُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُ اللّٰهِ﴾ ''(اے نبیؐ!) جب یہ منافقین آپ کی خدمت میں حاضر

ہوتے ہیں تو گواہی دیتے ہیں کہ آپؐ اللہ کے رسول ہیں'' —— اسی سلسلۂ مضمون میں آگے یہ الفاظ آئے: ﴿اِتَّخَذُوْٓا اَیْمَانَھُمْ جُنَّۃً﴾ کہ ان منافقین نے اپنی قسموں کو اپنے لئے ڈھال بنالیا ہے۔

ایک اہم نفسیاتی حقیقت

تیسرا مرحلہ اس کے بعد ہے' لیکن اسے سمجھنے کے لئے ایک اہم نفسیاتی حقیقت کا جاننا بہت ضروری ہے۔ یہ ایک عام نفسیاتی حقیقت ہے کہ اگر آپ عمل کے میدان میں پیچھے رہ گئے ہوں تو وہ لوگ آپ کو ایک آنکھ نہیں بھاتے جو اپنی ہمت کی بدولت آپ سے آگے نکل گئے ہوں۔ آپ کی خواہش یہ ہوگی کہ وہ بھی پیچھے رہ جائیں' اس لئے کہ ان کے آگے بڑھنے نے ہماری کمزوری کو مزید نمایاں کر دیا۔ اگر ہم سب کے سب کھڑے رہ جاتے اور کوئی بھی ہمت اور جرأت کا مظاہرہ نہ کرتا تو سب کے سب ایک ہی درجے میں آجاتے۔ نتیجتاً اس سے ان کم ہمت لوگوں کے دلوں میں ان مؤمنین و صادقین کے لئے کہ جو غلبہ و اقامتِ دین کے لئے جان اور مال کی بازیاں کھیل رہے ہوتے ہیں' نفرت اور عداوت کے جذبات پیدا ہو جاتے ہیں۔ ان لوگوں کے خلاف دشمنی کے جذبات سینوں میں پروان چڑھنے لگتے ہیں جو ایمان کے تقاضوں کے جواب میں آگے بڑھ کر اس شان سے لبیک کہنے والوں میں ہوں کہ اگر مال کا مطالبہ ہے تو جو میسر ہے حاضر ہے' جان کا تقاضا ہے تو سر بکف حاضر ہیں۔ سچے اہل ایمان اور ان کی سرفروشیوں کے خلاف اگر یہ احساسات اور جذبات پیدا ہونے لگیں تو جان لیجئے کہ یہ مرضِ نفاق کی وہ تیسری اور آخری منزل ہے جو ناقابل علاج ہے۔ اب اس مرض سے رستگاری کی کوئی صورت موجود نہیں! تو یہ ہے درحقیقت نفاق کا نقطۂ آغاز' اس کا اصل سبب اور اس مہلک مرض کے مختلف مراحل و مدارج۔ اللہ تعالیٰ ہمیں نفاق کی ہر صورت سے محفوظ رکھے۔ آمین!

ربیع الاول ۱۴۰۱ھ میں پاکستان ٹیلی ویژن پر پیش کیا جانے والا سلسلۂ تقاریر

رسول کامل ﷺ

مقرر : ڈاکٹر اسرار احمد

(۹)

انقلاب دشمن طاقتوں کا خاتمہ
خلافتِ صِدّیقی

اعوذ باللّٰہ من الشیطٰن الرجیم بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم

﴿ اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ ۝ وَرَاَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُوْنَ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا ۝ فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْهُ ۭ اِنَّهٗ كَانَ تَوَّابًا ۝ ﴾ (النصر)

ہم یہ دیکھ چکے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ کی حیاتِ دُنیوی کے آخری چار سال کے دوران' یعنی صلح حدیبیہ کے بعد آنحضور ﷺ کی جِدّوجُہد نے واضح طور پر دو رخ اختیار کر لئے ـــــ یعنی ایک طرف آپ ﷺ کی بعثت خصوصی اِلٰی اَھْلِ الْعَرب کے مقاصد کی تکمیل کے ضمن میں پورے جزیرہ نمائے عرب پر اللہ کے دین کا بالفعل قیام اور نفاذ ـــــ اور دوسری طرف آپ ﷺ کی بعثت عمومی اِلٰی کَافَّۃِ النَّاسِ کے مقاصد کی تکمیل کے ضمن میں پیغامِ محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کی تمام اقوام وملل عالم کو تبلیغ اور پورے کرۂ ارضی پر اللہ کے دین کے غلبے کے لئے سعی وجہد کا آغاز۔

حجۃ الوداع کو اس ضمن میں ایک سنگِ میل کی حیثیت حاصل ہے۔ اس موقع پر ایک طرف یہ بات بالکل ظاہر ہو گئی کہ اب پورے جزیرہ نمائے عرب پر اللہ کا دین فیصلہ کن طور پر غالب ہو چکا ہے اور دوسری جانب نبی اکرم ﷺ نے اپنی بعثت عامہ کے فرائض کی تکمیل کے لئے ساری ذمہ داری امت کے حوالے فرمادی یہ حکم دے کر کہ :

((فَلْيُبَلِّغِ الشَّاهِدُ الْغَائِبَ)) (متفق علیہ)

"اب پہنچائیں اس پیغام کو وہ لوگ جو یہاں موجود ہیں اُن سب لوگوں کو جو یہاں

موجود نہیں ہیں۔"

حجۃ الوداع سے واپسی کے فوراً بعد ایسے محسوس ہوتا ہے کہ جیسے نبی اکرم ﷺ کی روحِ مبارک اس عالمِ ناسوت میں مزید قیام کے لئے بالکل تیار نہ ہو اور اس پر رفیقِ اعلیٰ کی جانب مراجعت کا جذبہ شدت سے غالب آچکا ہو۔ چنانچہ حج کے بعد آپؐ کی حیاتِ دُنیوی کے کُل اسّی (۸۰) یا نوے (۹۰) دن ہیں۔ اس لئے کہ مختلف روایات کی رو سے ۱۸ یا ۱۹' یا ۲۸ یا ۲۹ صفر المظفر ۱۳ھ کو نبی اکرم ﷺ کے مرضِ وفات کا آغاز ہو گیا اور ۲ یا ۳' یا ۱۲ یا ۱۳ ربیع الاوّل کو نبی اکرم ﷺ کی روحِ مبارک نے آپؐ کے جسدِ عنصری سے پرواز کر لی۔ آخری ایّام میں بالکل ایسے محسوس ہوتا تھا کہ آپؐ پر اب اس دُنیا میں جو بھی لمحہ گزر رہا ہے' بڑا شاق گزر رہا ہے۔ چنانچہ اپنے مرضِ وفات کے دوران آپ ﷺ نے خطبہ بھی ارشاد فرمایا۔ جب ذرا افاقہ ہوا اور آپؐ اپنے حجرے سے برآمد ہوئے تو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ آپؐ کے حکم کے مطابق امامت فرما رہے تھے اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ان کی امامت میں نماز ادا فرما رہے تھے۔ حضور ﷺ تشریف لائے' حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے پیچھے ہٹنا چاہا' لیکن حضور ﷺ نے اشارے سے انہیں حکم دیا کہ نماز جاری رکھو' اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے پہلو میں بیٹھ کر نماز ادا فرمائی اور اس کے بعد آپؐ نے خطبہ ارشاد فرمایا:

"اللہ نے اپنے ایک بندے کو یہ اختیار دیا کہ وہ چاہے تو دنیا کی نعمتیں قبول کر لے اور چاہے تو جو کچھ اُس کے پاس ہے' یعنی عالمِ اُخروی کی نعمتیں' انہیں اختیار کر لے' تو بندے نے جو کچھ ربّ کے پاس ہے' اسے قبول کر لیا۔"

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ یہ سن کر رو پڑے۔ اس لئے کہ انہیں اندازہ ہو گیا کہ درحقیقت نبی اکرم ﷺ یہ خود اپنی بات فرما رہے ہیں اور آپؐ نے ہم سے جدائی اور رفیقِ اعلیٰ کی طرف مراجعت کا فیصلہ کر لیا ہے۔

نبی اکرم ﷺ کا وصال یقیناً اُمّتِ مسلمہ کیلئے اور بالخصوص صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی جماعت کیلئے ایک انتہائی رنج و غم' اندوہ اور صدمے کی بات تھی' لیکن ظاہر ہے کہ نبی اکرم ﷺ جو مشن امت کے حوالے کر کے گئے تھے اس کی تکمیل نہایت اہمیت کی حامل تھی۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ آنحضور ﷺ نے جو نظمِ جماعت قائم فرمایا تھا' اب اس کا ظہور ہوتا ہے۔ وہ کتنا پختہ نظمِ جماعت تھا کہ فوراً ہی مشوروں سے تمام مراحل طے پا گئے اور نبی اکرم ﷺ نے

جنہیں نماز کی امامت کیلئے آگے بڑھایا تھا اور جنہوں نے حضور ﷺ کی حیات کے دوران امام بن کر مسلمانوں کو ۱۷ نمازیں پڑھائی تھیں انہی کی خلافت پر اُمّت کا اجماع ہو گیا۔ حضرت ابوبکر بلاشبہ صدّیق اکبر ہیں رضی اللہ عنہ۔ اور یہ جان لینا چاہئے کہ مقامِ صدّیقیت' مقامِ نبوّت سے بہت قرب رکھتا ہے' بلکہ شیخ احمد سرہندی المعروف بہ مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کا قول تو یہ ہے کہ "حقیقت صدیقی ظل حقیقت محمدی است۔" یعنی مقامِ صدّیقی در حقیقت مقامِ نبوّت کا ظِل اور سایہ ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ جزیرہ نمائے عرب میں جس انقلاب کی تکمیل فرما گئے تھے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی کل اڑھائی سالہ خلافت کے دوران اس کے از سرِ نو استحکام کا عمل بتمام و کمال پورا ہوا۔

تاریخ عالم میں جتنے انقلابات آئے ہیں ان سب میں آپ کو ایک بات قدرِ مشترک کے طور پر ملے گی کہ انقلاب جب اپنے آخری مراحل میں ہوتا ہے تو اس وقت انقلاب دشمن طاقتیں کونوں اور کھدروں میں دبک جایا کرتی ہیں اور منتظر رہتی ہیں کہ پھر جب بھی موقع ہو' وہ سر اٹھائیں اور انقلاب پر حملہ آور ہوں اور اسے ناکام کرنے کی کوشش کریں۔ چنانچہ یہی عمل ہے جو نبی اکرم ﷺ کے وصال کے فوراً بعد ہمیں جزیرہ نمائے عرب میں ہر چہار طرف نظر آتا ہے۔ ایک سماں یہ تھا کہ فرمایا گیا: وَرَاَیْتَ النَّاسَ یَدْخُلُوْنَ فِیْ دِیْنِ اللّٰہِ اَفْوَاجًاo "(اے نبی!) آپ نے دیکھ لیا کہ لوگ داخل ہو رہے ہیں اللہ کے دین میں فوج در فوج"۔ لیکن حضور ﷺ کے انتقال کے بعد عارضی طور پر منظر یہ سامنے آیا کہ "یَخْرُجُوْنَ مِنْ دِیْنِ اللّٰہِ اَفْوَاجًا" کا سا معاملہ ہو گیا۔ لوگ فوج در فوج اللہ کے دین سے نکلنے لگے۔ ایک جانب نبوتِ کاذبہ کے دعوے دار' جھوٹے مدّعیانِ نبوت کھڑے ہو گئے اور ان کی دعوت پر بھی لاکھوں کی تعداد میں لوگوں نے لبیک کہا۔ دوسری طرف ایک کثیر تعداد میں لوگ زکوٰۃ سے انکار کر کے کھڑے ہو گئے کہ ہم توحید کی گواہی دیں گے' ہم رسالت کی گواہی دیں گے' نماز بھی قائم کریں گے' لیکن زکوٰۃ ادا نہیں کریں گے۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ بظاہر بہت رقیق القلب انسان تھے۔ آپ رضی اللہ عنہ کا جسم بھی بہت ہی نحیف و نزار تھا' لیکن اس موقع پر یہ حقیقت سامنے آئی کہ اس بظاہر کمزور شخصیت کے اندر ہمت' صبر و استقامت اور ثبات کا ایک کوہِ ہمالیہ مضمر ہے۔ چنانچہ آپؓ نے بیک وقت ان تمام فتنوں سے مقابلہ فرمایا۔ حالانکہ بہت سے حضرات نے آپؓ کو مشورہ دیا کہ کم سے کم

مانعینِ زکوٰۃ کے معاملے میں حکمتِ عملی کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے فی الوقت کسی قدر نرمی سے کام لیا جائے۔ لیکن ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ مَیں اللہ کے رسولؐ کا جانشین ہوں۔ اَنَا خَلِیفَۃُ رَسُوْلِ اللّٰہِ۔ اور اللہ کے رسول ﷺ ہمیں جو دین دے کر گئے ہیں اس میں اگر سرِمُو بھی فرق کرنے کی کوشش کی گئی تو اور کوئی میرا ساتھ دے یا نہ دے ابوبکر (رضی اللہ عنہ) تن تنہا سب کا مقابلہ کرے گا۔ یہاں تک کہ آپؓ نے فرمایا کہ "یہ تو زکوٰۃ کا انکار کر رہے ہیں' اگر ایسا بھی ہو کہ حضور ﷺ کے زمانے میں زکوٰۃ کے اونٹوں کے ساتھ ان کی رسّیاں بھی آتی ہوں اور اب لوگ اونٹ دینا چاہیں لیکن رسّیاں نہ دینا چاہیں تو بھی مَیں ان سے قتال کروں گا۔"

یہ ہے وہ عزیمت' یہ ہے وہ صبر و ثبات کہ جس کا مظاہرہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی طرف سے ہوا۔ واقعہ یہ ہے کہ کبھی کبھی یہ خیال ہوتا ہے کہ نبی اکرم ﷺ کا قیام ابھی اس عالمِ ناسوت میں کچھ عرصہ مزید رہتا تو بہت اچھا ہوتا۔ آپ ﷺ اپنے انقلاب کے خلاف اٹھنے والی ان تمام مخالفانہ قوتوں (Reactionary forces) کا بھی بنفس نفیس خود اپنے دستِ مبارک سے استیصال فرما جاتے اور انقلاب کو از خود استحکام بخش کر پھر رفیق اعلیٰ کی جانب مراجعت فرماتے۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ حکمتِ خداوندی میں کچھ اور ہی پیشِ نظر تھا۔ چنانچہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے اس مقام و مرتبہ کا اظہار ہرگز نہ ہو پاتا اگر یہ پوری صورتِ حال اس طرح پیش نہ آتی جیسی کہ فی الواقع پیش آئی کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ ان تمام فتنوں کا استیصال فرماتے اور ان تمام انقلاب دشمنوں کا سرکچل کر انقلابِ محمدی ﷺ کو از سرِ نو مستحکم فرماتے۔ کل اڑھائی برس میں آپ رضی اللہ عنہ نے اپنے رفیق غار ﷺ کے انقلاب کو مستحکم کیا اور پھر اللہ کی طرف مراجعت اور اپنے رفیق غار' اپنے محبوب' اپنے رسول ﷺ کے پہلو میں تا قیامِ قیامت استراحت فرمائی۔

دوسری جانب چونکہ خلافتِ راشدہ درحقیقت نبوی مشن کی تکمیل کا ذریعہ ہے' یہی وجہ ہے کہ جب لوگوں نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے یہ کہنا شروع کیا کہ آپ خلیفۃ اللہ ہیں یا خلیفۃ المسلمین ہیں' تو انہوں نے فرمایا نہیں! مَیں تو خَلِیفَۃُ رَسُوْلِ اللّٰہِ ہوں۔ خلافت راشدہ کو اسی وجہ سے خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کہا گیا ہے' نبوت کے نقشِ قدم پر خلافت۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ کی بعثتِ عامہ یعنی آپ ﷺ کی رسالت کے مقاصد میں سے جس مقصد کا تعلق پورے عالمِ ارضی سے تھا اس کی تکمیل کے لئے جس عمل کا آغاز نبی اکرم ﷺ نے

بنفسِ نفیس فرمایا تھا اس کو بھی ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے آگے بڑھایا۔

جیشِ اُسامہ رضی اللہ عنہ کا معاملہ اس حوالے سے بہت نمایاں ہو کر سامنے آتا ہے۔ ان کے بارے میں بھی بہت سے حضرات نے پُرخلوص مشورہ دیا کہ فی الوقت اندرونِ ملک عرب اتنے فتنے اٹھ کھڑے ہوئے ہیں کہ اگر آپ صرف ان سے نبرد آزما ہو جائیں تو بہت کافی ہے' ہمردست اس لشکر کی روانگی ملتوی فرما دیجئے۔ لیکن یہاں بھی وہ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ اسی عزیمت کے ساتھ یہ کہتے ہیں کہ جس لشکر کی روانگی کا فیصلہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا تھا اس کی روانگی کو مؤخر کرنے والا میں کون ہوں؟ یہ تو پھر خلافت کا تقاضا نہ ہوا' یہ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے کئے ہوئے فیصلوں کا ایک reversal ہے' اُن میں ترمیم ہو جائے گی۔ چنانچہ جیشِ اسامہ رضی اللہ عنہ کو روانہ کیا گیا۔ اور اس فیصلہ کو بھی قائم رکھا گیا کہ اس کی سرکردگی حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کو دی گئی' حالانکہ وہ بالکل نوجوان تھے۔ اس پر بھی جب یہ کہا گیا کہ ذرا اس فیصلے میں ترمیم کر لیجئے تو پھر اس جانشین رسول کا وہی قول سامنے آیا کہ جس کو عَلَم سنبھلوایا ہو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے' میں اس کے ہاتھ سے عَلَم لینے والا کون ہوتا ہوں؟

حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ جب لشکر لے کر چلے ہیں اور ان کے ساتھ ساتھ خلیفۂ وقت پیدل چلے اور جب حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ احتراماً سواری سے اترنے لگے تو منع فرما دیا۔ یہ ہے شان حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی اور یہ ہے درحقیقت مقام اور مرتبہ خلافت صدیقی کا!

ایک اور بہت بڑا احسان جو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اُمّتِ مُسلمہ پر فرمایا' وہ ہے قرآن مجید کا جمع کرنا' جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ تک معروف معنی میں ایک کتاب کی شکل میں جمع نہ تھا' یعنی "مَابَیْنَ الدَّفَّتَیْنِ" جیسے ایک کتاب ہوتی ہے' جلد کے دو گتّوں کے مابین' صفحات میں مرتب صورت میں لکھی ہوئی' ایسے نہ تھا۔ اگرچہ ترتیب کا حکم حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دے دیا تھا۔ ترتیب آپؐ نے قائم بھی فرما دی تھی۔ آیات کو جمع کر کے سورتوں کی شکل دینا اور سورتوں کا باہمی نظم اور ربط' یہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خود کر دیا تھا۔ لیکن ابھی کسی کے پاس لکھی ہوئی کچھ سورتیں تھیں' کسی کے پاس کچھ اور دوسری سورتیں تھیں' کہیں کپڑے پر لکھی ہوئی' کہیں ہڈیوں پر لکھی ہوئی' کہیں کاغذوں پر لکھی ہوئی' اور سب سے بڑھ کر لوگوں کے سینوں میں قرآن مجید محفوظ تھا۔ لیکن جب حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے عہدِ خلافت میں بہت سی جنگیں ہوئیں اور ان میں بہت سے صحابہ رضی اللہ عنہم نے جامِ شہادت نوش فرمایا' خصوصاً

جنگِ یمامہ میں بہت سے حُفّاظ شہید ہو گئے' تب یہ خیال پیدا ہوا کہ قرآن ایک مصحف کی صورت میں محفوظ کیا جائے۔ اس خیال کو سب سے پہلے ظاہر کرنے والے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ ہیں کہ قرآن مجید کو ایک مصحف کی شکل میں جمع کر لیا جائے' ایسا نہ ہو کہ حفاظ کی کثیر تعداد شہید ہو جائے اور کہیں قرآن مجید کا کوئی حصہ ضائع ہو جائے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا یہ فیصلہ کہ :

﴿ اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحَافِظُوْنَ ۝ ﴾ (الحجر : ۹)

"ہم نے ہی اس ذکر کو نازل فرمایا ہے اور ہم ہی اس کی حفاظت فرمانے والے ہیں۔"

حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے ہاتھوں اس ارادۂ خداوندی کی تعمیل ہوئی۔ چنانچہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کو جو حضور ﷺ کے زمانے میں کاتبِ وحی رہے تھے' حکم دیا کہ وہ قرآن مجید کو جمع کریں۔ وہ یہ فرماتے ہیں کہ مجھے اگر کسی پہاڑ کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرنے کی خدمت سپرد کی گئی ہوتی تو وہ بھی مجھ پر اتنی بھاری نہ ہوتی جتنا بوجھ مَیں نے اس ذمہ داری کا محسوس کیا۔

بہرحال نبی اکرم ﷺ نے اپنے حجۃ الوداع میں تو یہ ہدایت فرمائی تھی کہ :

((وَقَدْ تَرَكْتُ فِيْكُمْ مَا لَنْ تَضِلُّوْا بَعْدَهٗ اِنِ اعْتَصَمْتُمْ بِهٖ : كِتَابُ اللّٰهِ)) (صحيح مسلم' كتاب الحج)

"اور یقیناً مَیں تمہارے درمیان وہ چیز چھوڑے جا رہا ہوں جس کا سرِشتہ اگر مضبوطی سے تھامے رہو گے تو ہرگز گمراہ نہ ہو سکو گے' اور وہ چیز ہے کتاب اللہ۔"

یعنی اے میری اُمّت! میں جا رہا ہوں لیکن تمہیں بے سہارا اور بے یار و مددگار نہیں چھوڑ کر جا رہا' بلکہ تمہارے مابین وہ چیز چھوڑ چلا ہوں کہ جسے اگر مضبوطی سے تھام لو گے تو کبھی گمراہ نہ ہو گے' اور وہ اللہ کی کتاب ہے۔ تو یہ بھی مقامِ صِدّیقیت اور مقامِ نبوّت کے باہمی اتّصال کا ایک مظہر ہے کہ اس کتاب کو بین الدُّفّتین کی شکل دی حضرت ابو بکر صدیق نے' رضی اللہ تعالیٰ عنہ وارضاہ۔

اللہ تعالیٰ ہمیں اس کتابِ الٰہی سے صحیح تمتع کی توفیق عطا فرمائے۔

فَصَلَّى اللّٰهُ عَلٰى مُحَمَّدِ الْاَمِيْنِ وَعَلٰى آلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ اَجْمَعِيْنَ
وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ ۝۝

نفسِ انسانی کے مختلف پہلو
اور اس کی متنوّع کیفیتیں
قرآن حکیم کی روشنی میں

ڈاکٹر اسرار احمد

ایک تقریر جو پانچویں بین الاقوامی مسلم سائیکالوجی کانفرنس
منعقدہ جناح لائبریری ہال لاہور میں بتاریخ ۱۶/ فروری ۲۰۰۱ء کی گئی

خطبہ مسنونہ' چند قرآنی آیات کی تلاوت' اور ادعیہ ماثورہ کے بعد عرض کیا گیا :

جناب صدرِ مجلس محترم ملک معراج خالد صاحب' اصحابِ علم و فضل اور معزّز خواتین و حضرات!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ'

علماء و طلبۂ نفسیات کی اس محفل میں میرا خطاب کچھ اٹپل بے جوڑ سی بات ہے' اس لئے کہ مَیں کبھی سائیکالوجی کا طالب علم نہیں رہا۔ تاہم جب مجھے اس کی محبت بھری اور نہایت الحاح و اصرار پر مبنی دعوت ملی' تو میں ایک تو اس بناء پر آمادہ ہو گیا کہ مَیں قرآن حکیم کا طالب علم بہرحال ہوں' اور قرآن جہاں عمرانیات کے دوسرے شعبوں کے بارے میں حکمت و احکام عطا فرماتا ہے وہاں آفاق و انفس اور ان کی وسعتوں اور گہرائیوں کی جانب بھی نہایت حکیمانہ اور بصیرت افروز اشارے کرتا ہے۔ بنا بریں میں نے سوچا کہ نفس انسانی کے مختلف پہلوؤں اور اس کی متنوع کیفیات کے ضمن میں جو روشنی مجھے اپنے

پچاس سالہ مطالعۂ قرآن سے حاصل ہوئی ہے اسے آپ حضرات کے ساتھ share کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے!

ویسے نفسیات کے علم سے مجھے ابتداء ہی سے دلچسپی بھی رہی ہے ـــــ چنانچہ اس کے باوجود کہ میں نے اپنی میڈیکل کی تعلیم کے سال دوم کے دوران ہی یہ فیصلہ کرلیا تھا کہ "میری زندگی میں ڈاکٹری کے فن یا پیشے کو صرف ثانوی حیثیت حاصل رہے گی' اوّلیت کا درجہ اللہ کے دین کو عملاً قائم کرنے کی جدوجہد اور اس کے لئے قرآن کے علوم و معارف کی تحصیل اور نشر و اشاعت کو حاصل رہے گا"۔ تاہم ایم بی بی ایس کی تعلیم کے آخری سال کے دوران اگر میڈیکل لائن میں اعلیٰ تعلیم یعنی Post Graduation کا کوئی خیال آیا تو وہ صرف D.P.M. (ڈپلومہ ان سائیکولوجیکل میڈیسن) ہی کا تھا ـــــ اگرچہ' اسی سبب سے جس کا ذکر پہلے ہوگیا ہے' اس کی نوبت نہیں آئی۔

مَیں نے فلسفہ اور منطق کی تعلیم بھی اگرچہ باضابطہ کبھی حاصل نہیں کی ـــــ تاہم کچھ اس بنا پر کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے ذہن منطقی عطا فرمایا ہے' اور کچھ اس سبب سے کہ قرآن حکیم کے اصل اور اساسی موضوع یعنی ایمان کے ڈانڈے لامحالہ فلسفہ سے ملتے ہیں ـــــ مجھے اس علم سے بھی فطری شغف رہا ـــــ اور خصوصاً تحلیل نفسی اور نفس انسانی میں مختلف بلکہ متضاد رجحانات کے باعث پیدا ہونے والے conflicts کے تجزیئے سے بہت دلچسپی رہی ہے۔

چنانچہ زمانہ طالب علمی ہی کا ایک دلچسپ واقعہ ہے کہ جب میں فائنل ایئر ایم بی بی ایس کا امتحان دے رہا تھا' میرے ایک دوست اور ہم مقصد ساتھی (یعنی اسلامی جمعیت طلبہ کے کارکن) اظہر حسن صدیقی سیکنڈ پروفیشنل کا امتحان دے رہے تھے ـــــ اس وقت میں نے ان کی جو کیفیت دیکھی اس کی بنا پر ان سے کہا کہ: "اظہر صاحب! آپ کبھی امتحان دیتے ہوئے ذہنی توازن کھو بیٹھیں گے!" تاہم میری اس بات کو سنجیدگی سے نہ لیا گیا ـــــ اور بات ہنسی میں ٹل گئی ـــــ لیکن میری یہ پیشین گوئی حیرت انگیز طور پر اگلے ہی سال درست ثابت ہوگئی ـــــ میں تو ایم بی بی ایس سے فارغ ہو کر منٹگمری (ساہیوال) منتقل ہو چکا تھا ـــــ اظہر صاحب تھرڈ پروفیشنل کے امتحان کے دوران ایک زبانی امتحان (VIVA-VOCE) میں دفعتاً پٹڑی سے اتر گئے اور ممتحن سے کہنے لگے:

"چھڈ یار! گلاں بعد وچ ہون گیاں' پہلے سگریٹ پیا!" (واضح رہے کہ اظہر صاحب پنجابی نہیں بلکہ اردو سپیکنگ لوگوں میں سے تھے!) ـــــ بہرحال پہلے ان کا علاج کراچی میں کرایا گیا۔ اُس وقت تک غالباً پورے ملک میں کوئی ایک بھی باضابطہ سند یافتہ ذہنی معالج موجود نہ تھا۔ کراچی میں ڈاکٹر افضل حبیب صاحب ہوتے تھے' لیکن وہ بھی غالباً سند یافتہ ڈی۔ پی۔ ایم نہیں تھے ـــــ اور اس پر مستزاد یہ کہ بہت مہنگے معالج تھے ـــــ چنانچہ اظہر صاحب کے لواحقین انہیں اپنے وطن مالوف بریلی (بھارت) لے گئے جہاں سے ہجرت کر کے یہ خاندان پاکستان آیا تھا۔ اور وہ کئی ماہ وہاں مقیم رہ کر صحت یاب ہو کر واپس آئے اور اپنی ادھوری تعلیم کی تکمیل کے لئے لاہور آئے تو ایک روز اچانک ان سے سرراہے ملاقات ہو گئی جس پر وہ چھوٹتے ہی کہنے لگے: "دیکھئے! اب دوبارہ وہی بات نہ کہہ دیجئے!" جس پر میں نے عرض کیا کہ آپ میرے کہنے کے باعث بیمار نہیں ہوئے تھے بلکہ اپنی ترجیحات کو متعین نہ کرنے کے باعث اس حادثہ سے دوچار ہوئے تھے۔ (ڈاکٹر اظہر حسن صدیقی' جماعت اسلامی کے نامور رہنما اور نائب امیر جناب پروفیسر غفور احمد صاحب کے برادر نسبتی ہیں' اور آج کل ماشاء اللہ کراچی میں بہت کامیاب اور مقبول عام میڈیکل پریکٹیشنر کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں)

اظہر صاحب کے بارے میں میری اس پیشین گوئی کی بنیاد ایک مخمصہ (dilemma) پر قائم تھی' جس سے خود میں بھی دوچار رہا تھا ـــــ اور وہ یہ کہ ایک جانب ہم اسلام کی دعوت و اقامت کی جِدّوجُہد میں بڑھ چڑھ کر حصّہ لینا چاہتے تھے ـــــ اور دوسری طرف یہ بھی چاہتے تھے کہ اپنی فنی تعلیم اور کیریئر کے ضمن میں بھی اپنے سابقہ اعلیٰ معیار کو قائم رکھیں ـــــ اور یہ ظاہر ہے کہ اَن ہونی اور ناممکن بات تھی۔ ادھر میں نے تو آغاز ہی میں (یعنی میڈیکل کالج کے دوسرے سال ہی کے دوران) اپنی وہ واضح ترجیح طے کر لی تھی جو پہلے بیان ہو چکی ہے ـــــ لیکن اظہر صاحب نے ایسا کوئی واضح فیصلہ نہیں کیا تھا ـــــ بنابریں دو متضاد سمتوں کی کشاکش نے ان کے ذہن کی گاڑی کو پٹڑی سے اتار دیا۔

نظری علم النفس (Theoretical Psychology) کے علاوہ مجھے ایک ذہنی مریض کی بھی مسلسل تیرہ سال تک تیمارداری کا تجربہ ہے ـــــ میں ۱۹۵۲ء میں سیکنڈ پروفیشنل ایم بی بی ایس کا امتحان دے رہا تھا جب والد صاحب مرحوم کو ذہنی عارضہ کا پہلا

حملہ ہوا ـــــ اور ایم بی بی ایس سے فراغت کے بعد میں اسی لئے منٹگمری منتقل ہوا تھا کہ والد صاحب کی تیمار داری کر سکوں ـــــ چنانچہ ۱۹۶۵ء میں ان کے انتقال تک مسلسل تیرہ برس تک مَیں ان کی Excitation اور Depression کی alternate cycles کا مشاہدہ کرتا رہا ـــــ اور اگرچہ میں D.P.M. تو نہ کر سکا لیکن اس فن کی ابجد سے کم از کم "Dispenser" ہونے کی حد تک واقف ضرور ہو گیا!

اس تمہید کے بعد عرض ہے کہ :

قرآن حکیم کی رو سے "آیات" یعنی نشانیوں کے الفاظ کا اطلاق بنیادی طور پر تین چیزوں پر ہوتا ہے ـــــ ایک آیاتِ قرآنی ـــــ دوسرے آیاتِ آفاقی ـــــ اور تیسرے آیاتِ انفسی! ـــــ اور ایک مقام پر ان تینوں کو اس طور سے متعلق و مربوط قرار دیا گیا ہے کہ :

﴿ سَنُرِيْهِمْ اٰيٰتِنَا فِي الْاٰفَاقِ وَفِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ ﴾

(حٰمٓ السجدۃ : ۵۲)

یعنی "ہم عنقریب لوگوں کو اپنی نشانیاں دکھائیں گے آفاق میں بھی اور ان کے اپنے نفوس میں بھی ـــــ یہاں تک کہ یہ بات اُن پر پوری طرح واضح ہو جائے گی کہ یہ (یعنی آیاتِ قرآنیہ) سراسر حق ہیں!"۔

ترجمان القرآن علامہ اقبال نے ایک طرف آیاتِ آفاقی کی جانب اشارہ کیا ہے اپنے اس شعر میں کہ ؎

کھول آنکھ ' زمیں دیکھ' فلک دیکھ ' فضا دیکھ
مشرق سے ابھرتے ہوئے سورج کو ذرا دیکھ!

اور دوسری طرف آیاتِ انفسی کی جانب متوجہ کیا ہے' اپنے ان الفاظ کے ذریعے کہ ع :

اپنے من میں ڈوب کر پا جا سراغِ زندگی!

اور اپنی شہرۂ آفاق نظم "لینن خدا کے حضور میں" کے تو پہلے ہی شعر میں دونوں کو جمع کر دیا ہے۔ یعنی ؎ اے انفس و آفاق میں پیدا تری آیات
حق یہ ہے کہ ہے زندہ و پائندہ تری ذات!

چنانچہ واقعہ یہی ہے کہ حقائقِ کونیہ اور حقیقت الحقائق تک رسائی کے یہی دو راستے ہیں: یعنی ایک بنیادی طور پر "بیروں بین" لوگوں یعنی Extroverts کے لئے ـــــ جیسے کہ قرآن کہتا ہے:

﴿ اَفَلَا یَنْظُرُوْنَ اِلَی الْاِبِلِ کَیْفَ خُلِقَتْ○ وَاِلَی السَّمَآءِ کَیْفَ رُفِعَتْ○ وَاِلَی الْجِبَالِ کَیْفَ نُصِبَتْ○ وَاِلَی الْاَرْضِ کَیْفَ سُطِحَتْ○ ﴾ (الغاشیۃ : ۱۷-۲۰)

یعنی "کیا یہ لوگ اونٹ کو نہیں دیکھتے کہ اسے کیسے (ماحول کے ساتھ صد فی صد مطابقت رکھنے والا) بنا دیا گیا ہے' اور آسمان کو نہیں دیکھتے کہ کیسے بلند کر دیا گیا ہے ـــــ اور پہاڑوں کو نہیں دیکھتے کہ کیسے گاڑ دیئے گئے ہیں' اور زمین کو نہیں دیکھتے کہ کیسے ہموار کر دی گئی ہے!" ـــــ

اور دوسرا "دروں بین" لوگوں یعنی Entroverts کیلئے ـــــ جیسے فرمایا گیا ہے کہ :

﴿ وَفِی الْاَرْضِ اٰیٰتٌ لِّلْمُوْقِنِیْنَ○ وَفِیْٓ اَنْفُسِکُمْ ؕ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ○ ﴾ (الذّٰریٰت : ۲۰'۲۱)

یعنی "زمین میں بھی یقین کرنے والوں کے لئے (اللہ کی) نشانیاں ہیں۔ اور خود تمہارے اپنے نفوس میں بھی' تو کیا تم مشاہدہ نہیں کرتے؟"

اس دوسری راہ کے ضمن میں میرزا عبدالقادر بیدلؒ کا ایک نہایت فصیح و بلیغ اور دلکش اور دل آویز شعر ہے کہ ؎

ستم است گر ہوست کشد کہ بہ سیرِ سرو و سمن در آ
تو ز غنچہ کم نہ دمیدہ ای ' درِ دل کشا بہ چمن در آ!

یعنی "بڑے ستم کی بات ہے کہ تمہاری خواہش تمہیں اس طرف تو کھینچے کہ چلو باہر چل کر سرو و سمن کے حسن سے فیض یاب ہو ـــــ جبکہ اے انسان! تو خود کسی غنچے اور پھول سے کم کھلا ہوا نہیں ہے ـــــ ذرا کبھی دل کا دروازہ کھول کر اپنے باطن میں لہلہاتے ہوئے چمن کی بھی سیر کر!" ـــــ

اب ذرا آیاتِ آفاقی کو علماء طبیعیات و فلکیات وارضیات و کیمیا وغیرہ کے سپرد کر کے "آیت انفسی" پر توجہ مرکوز کریں ـــــ تو پہلی بات یہ سامنے آتی ہے کہ قرآن حکیم میں "نفس" کا لفظ بہت سے مختلف معنوں میں استعمال ہوا ہے ـــــ جیسے :

❶ کلی ذات یا شخصیت کے لئے ـــــ جس کی سب سے نمایاں مثال یہ ہے کہ خود اللہ کی ذات یا ہستی کیلئے بھی یہ لفظ استعمال ہوا ہے' جیسے ﴿ وَيُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفْسَهٗ ﴾ کے الفاظ میں جو سورۂ آل عمران میں دو مقامات (آیت ۲۸' آیت ۳۰) پر وارد ہوئے ہیں ـــــ یعنی "اللہ تمہیں اپنی (یعنی خود اللہ کی) ذات سے ڈراتا اور خبردار کرتا ہے!"

❷ انسانی وجود کے کسی ایک پہلو یا جزو کے لئے ـــــ جیسے ایک جانب انسانی "جان" کے لئے استعمال ہوا کہ موت کا فرشتہ جان نکالنے آتا ہے تو کہتا ہے: ﴿ اَخْرِجُوْٓا اَنْفُسَكُمْ ﴾ (الانعام : ۹۳) یعنی "نکالو اپنی جانیں!" ـــــ گویا جان یا life کو جو وجودِ انسانی کا جزو ہے اس کا نفس قرار دیا جا رہا ہے ـــــ دوسری جانب انسان کی معنوی و باطنی شخصیت کے دو مختلف بلکہ متضاد پہلوؤں کے لئے بھی جو انسان کے رویئے اور طرزِ عمل پر اثر انداز ہوتے ہیں' یہی لفظ "نفس" استعمال ہوا ہے! ـــــ یعنی ایک برائی اور شر کی جانب راغب کرنے والا نفس بفحوائے آیۂ قرآنی : ﴿ وَمَآ اُبَرِّئُ نَفْسِيْ ۚ اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌۢ بِالسُّوْٓءِ ﴾ (سورۂ یوسف : ۵۳) یعنی "میں اپنے نفس کو بری الذِّمّہ قرار نہیں دیتا (یا دیتی' حسبِ اختلافِ تفسیر) یقیناً اس کا تو کام ہی یہ ہے کہ برائی کی طرف شدّ و مد کے ساتھ راغب کرے!" ـــــ اور دوسرے انسانی شخصیت کے اس باطنی عنصر پر جو خیر اور بھلائی کی ترغیب دیتا ہے اور اگر انسان سے کوئی غلط فعل سرزد ہو جائے تو اس پر شدید ملامت کرتا ہے' اور جسے عام اردو محاورے میں "ضمیر" اور انگریزی میں Conscience سے تعبیر کیا جاتا ہے ـــــ چنانچہ قرآن نے اسے "نفسِ لوّامہ" (ملامت کرنے والا نفس) سے موسوم کیا ہے' اور اللہ تعالیٰ نے سورۂ قیامہ کے آغاز پر جہاں یومِ قیامت کی قسم کھائی ہے وہیں اس نفس ملامت گر کی بھی قسم کھائی ہے ـــــ بفحوائے : ﴿ لَآ اُقْسِمُ بِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ ۝ وَلَآ اُقْسِمُ بِالنَّفْسِ اللَّوَّامَةِ ۝ ﴾

انسان کی باطنی شخصیت کے ان دو متضاد محرکات و داعیات کا تعلق دراصل انسان کے وجود کے ان دو مختلف عناصر سے ہے جن کے باہمی امتزاج و ترکیب سے انسان وجود

میں آتا ہے۔ یعنی ایک وہ حیوانی وجود جو خاکی الاصل ہے ـــــ اور اپنے اندر وہ تمام داعیات اور محرکاتِ عمل رکھتا ہے جو ہر حیوان بالخصوص زیادہ ترقی یافتہ حیوانات میں پائے جاتے ہیں' یعنی بقائے ذات کے لئے کھانا' پینا' استراحت وغیرہ ـــــ اور بقائے نوع کے لئے شہوت و جنسی جذبہ!! ان پر مستزاد ہیں حُبِّ تفوّق (urge to dominate) اور تمدنی رجحان یعنی herd instinct وغیرہ ـــــ اور دوسرا وہ روحانی وجود جس کا تعلق عالمِ بالا سے ہے' جس کا واحد جذبۂ محرکہ (urge) کسی اعلیٰ نصب العین' ارفع آئیڈیل اور بلند آدرش کو اختیار کر کے اس کے حصول کے لئے تن من دھن قربان کر دینا ہے! انسان کا یہ روحانی وجود اپنی ماہیت میں ملائکہ کا ہم پلہ اور مقام و مرتبہ میں ان سے بھی بلند تر ہے ـــــ!

انسان کی شخصیت کے ان دو متمیز و متبائن پہلوؤں کی تعبیر سینکڑوں سال قبل شیخ سعدیؒ نے ان الفاظ میں کی تھی کہ ؎

"آدمی زادہ طرفہ معجون است ۔ از فرشتہ سرشتہ و ز حیواں"

یعنی انسانی شخصیت عجب چوں چوں کا مربّہ ہے کہ اس میں ایک جانب مکمل حیوان موجود ہے تو دوسری جانب ایک فرشتہ بھی موجود ہے۔

انسان کے حیوانی وجود کے بارے میں سائنس اور مذہب دونوں اس امر پر متفق ہیں کہ یہ مٹی اور پانی کے امتزاج سے وجود میں آیا ہے ـــــ اگرچہ اہل مذہب کا غالب رجحان Special Creation کی طرف ہے ـــــ جبکہ سائنس کا رجحانِ غالب Evolution کی جانب ہے' اور خواہ کوئی شخص ڈارون کے نظریئے سے متفق نہ ہو' یہ بہرحال تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ اس نے تحقیق و تفتیش اور تجسّس و تفحص کا حق بہ تمام و کمال ادا کیا ـــــ اور پانچ سال تک جنوبی امریکہ کے گرد سمندری جہاز میں چکر پورا کر کے نباتات و حیوانات کے لاتعداد نمونے جمع کئے اور پھر ایک نظریہ مرتب کیا ـــــ اور قطع نظر اس کے کہ وہ نظریہ صحت پر مبنی ہے یا مغالطے پر' اس میں ہرگز کوئی شک نہیں کہ عمرانیاتِ انسانی میں اس کے ہلاکت خیز اثرات صرف اس لئے رونما ہوئے کہ انسان کو محض حیوان سمجھ لیا گیا ـــــ اور Post-Renaissance دور میں مذہب دشمنی کے

باعث روح اور روحانیت کی جانب سے آنکھیں بالکل بند کرلی گئیں ـــــ ورنہ اگر انسان کے روحانی وجود کو جداگانہ entity کی حیثیت سے تسلیم کرتے ہوئے ارتقاء کا تعلق صرف اس کے حیوانی وجود کے ساتھ قرار دیا جاتا تو ہرگز کوئی برے نتائج و عواقب پیدا نہ ہوتے۔

انسان کے روحانی وجود کا تعلق براہِ راست ذاتِ باری تعالیٰ سے ہے' بقول شخصے

اتّصالے بے تکیّف بے قیاس ۔ ہست ربّ الناس را باجانِ ناس

یعنی لوگوں کی جان (یہاں مراد نفس روحانی ہے) اللہ تعالیٰ کی ذات سے متصل اور ملحق تو ہے لیکن اس کے اس اتصال اور الحاق کی کیفیت کو کسی مادی مثال پر قیاس نہیں کیا جاسکتا ـــــ بعض مغربی دانشوروں نے بھی انسان کے باطن کے اس "شعلۂ ملکوتی" (Divine Spark) کا مشاہدہ کیا ہے۔ اور علامہ اقبال نے تو نہایت خوبصورت انداز میں فرمایا ہے کہ ؎

ہے ذوقِ تجلّی بھی اسی خاک میں پنہاں ۔ غافل تو نرا صاحبِ ادراک نہیں ہے!

یعنی ادراک و احساس تو جملہ حیوانات پر مستزاد کیمرے کی فلم کو بھی حاصل ہے' لیکن انسان کے باطن میں تو احساس اور ادراک پر مستزاد ایک ایسی حقیقت بھی موجود ہے جو خود اپنا ظہور چاہتی ہے اور بھڑک کر روشن ہونا چاہتی ہے۔

ہمارے حیوانی وجود کا منبع یہ زمین ہے' چنانچہ یہیں سے اس کی تقویت اور غذا کا سارا سامان بھی آرہا ہے۔ گندم کہاں سے آرہی ہے؟ چاول کہاں سے آرہا ہے؟ یا آپ نے اگر بکرے کا گوشت کھایا ہے تو بکرے کا گوشت اس سبزے یا گھاس سے بنا ہے جو اس نے کھایا ہے۔ source تو وہی ہے۔ وہی ہمارے حیوانی وجود کا source ہے اور وہی اس کو تغذیہ و تقویت کا سارا سامان فراہم کرتا ہے۔ اور ہمارا یہ وجود ہمیں نیچے کی طرف گھسیٹتا ہے' حیوانیت کی طرف' زمینی خواہشات کی طرف' یہ Id اور Libido ہے' جس کے متعلق قرآن کی آیت میں نے آپ کو سنائی ﴿ اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌۢ بِالسُّوْٓءِ..... ﴾ یہ Id اور Libido کا پہلو انسان کو برائی کی طرف لے جاتا ہے کیونکہ اس میں جو lusts اور desires ہیں وہ اندھے بہرے ہیں' انہیں جائز ناجائز میں فرق معلوم نہیں ہے' یہ حلال

حرام کی تمیز نہیں کر سکتے۔ بھوک لگی ہے تو اسے کچھ کھانے کو چاہئے' اس سے غرض نہیں ہے کہ جائز ہے یا ناجائز' حلال ہے یا حرام۔ sexual urge جب بیدار ہو جاتی ہے تو اسے بس اپنی تسکین چاہئے۔ اسے اس سے بحث نہیں ہوتی کہ جائز راستہ کون سا ہے اور ناجائز کونسا! لیکن ظاہر بات ہے کہ یہ پستی کے تقاضے ہیں' اسی لئے قرآن مجید میں ایک بہت بڑی شخصیت ـــــ بلعام بن باعورہ ـــــ کا حوالہ دیا گیا ہے (قرآن میں اس کا نام نہیں ہے' توریت میں اس کا ذکر ہے) ﴿ وَلٰكِنَّهٗٓ اَخْلَدَ اِلَى الْاَرْضِ ﴾ (الاعراف : ۱۷۶) "وہ شخص تو زمین کی طرف دھنستا چلا گیا۔" یعنی زمینی خواہشات کی طرف متوجہ ہو گیا۔

لیکن ہمارے وجود کا جو دوسرا عنصر ہے' یعنی روحانی' وہ زمینی نہیں ہے' خاکی نہیں ہے' وہ اللہ کی ذات سے آیا ہے۔ وہ "امر ربّ" ہے۔ بفحوائے الفاظِ قرآنی ﴿ وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ ۭ قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّيْ وَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا ۝ ﴾ (بنی اسرائیل : ۸۵) اور دوسری جگہ فرمایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرشتوں سے کہہ دیا تھا کہ جب میں اس آدمؑ کی تخلیق مکمل کر لوں اور اس کو نک سک سے درست کر دوں' اور finishing touches دے دوں' اور پھر اس میں اپنی روح میں سے پھونکوں تو گر پڑنا اس کے سامنے سجدے میں ﴿ فَاِذَا سَوَّيْتُهٗ وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِيْنَ ﴾ (الحجر:۲۹) یہ ہے وہ روحِ ربّانی جو میرے اور آپ کے اندر موجود ہے We are the custodians of the Divine Spirit ۔ اور دراصل ہماری یہ وہی Divine Spirit ہے جو ہمیں بلندی اور اعلیٰ مقامات کی طرف کھینچتی ہے ـــــ اور اگر ہم زمینی خواہشات و شہوات یعنی من جملہ پستی کی طرف مائل ہو جائیں تو ہمیں شد و مد سے ملامت کرتی ہے کہ ع "اپنی خودی پہچان! او غافل انسان!"

جدید نفسیات کے باوا آدم سگمنڈ فرائڈ نے انسان کے محرکاتِ عمل اور داعیاتِ نفس میں شہوت (sex) کو بہت زیادہ out of proportion اہمیت دے کر جو فکری سنڈاس ترتیب دیا ہے اس سے شدّت کے ساتھ اعلانِ براءت کرنے کے ساتھ ساتھ میں اس کے انسان کی باطنی شخصیت کے مشاہدے اور اس کے تین لیول identity کرنے کو غیر معمولی دقتِ نظر (acuteness of observation) پر مبنی قرار دیتا ہوں ـــــ یعنی سب سے نیچے Id یا Libido جو عبارت ہے انسان کے حیوانی جبلتوں اور

محرکاتِ عمل سے' اس سے اوپر Ego جو عبارت ہے خودی یا "انا" سے ـــــ اور سب سے بالاتر Super Ego جسے وہ تعبیر کرتا ہے معاشرتی تصورات واقدار سے ـــــ!

میرے مطالعہ قرآن کا حاصل یہ ہے کہ جسے فرائڈ نے Id یا Libido سے تعبیر کیا ہے وہ ہے قرآنی اصطلاح میں "نفسِ امّارہ" ـــــ اور جسے فرائیڈ Super Ego سے تعبیر کرتا ہے وہ ہے "نفسِ لوّامہ" یا بالفاظِ دیگر روحِ ملکوتی ـــــ یا "فاش تر گویم" کے مصداق "روحِ ربّانی"!

رہا وہ درمیانی لیول جسے فرائڈ Ego سے تعبیر کرتا ہے اور جسے عرفِ عام میں "انا" یا "خودی" سے تعبیر کیا جاتا ہے وہ قرآنی اصطلاح میں "قلب" ہے۔ اور قلب کو قلب کہتے ہی اس لئے ہیں کہ اس کی کیفیت بدلتی رہتی ہے۔ یہ ہمارے پورے جسمانی نظام کا ایک ایسا عضو ہے جسے ایک پل' ایک لحظہ بھی rest نہیں ملتا۔ آپ کا دماغ بھی آرام کرتا ہے' آپ کے سارے tissues ریسٹ کرتے ہیں' لیکن دل کے آرام کا دوسرا نام موت ہے۔ وہ ہر دم چل رہا ہے اور کبھی پھیل رہا ہے کبھی سکڑ رہا ہے۔ قلب کے لفظی معنی اسی بدلنے کے ہیں۔ قلبِ ماہیت اسے کہتے ہیں کہ کسی معاملے میں کوئی بنیادی تبدیلی یعنی essential change آگئی۔ انقلاب کا لفظ بھی اسی سے بنا ہے۔ کسی ملک کا اجتماعی نظام یعنی Politico-Socio-Economic سسٹم بدل جائے تو وہ انقلاب ہے۔ چنانچہ اگر قلب نفس کی طرف کھنچ گیا اور نفس کا غلام بن گیا تو اب انسان کی کیفیت نفسِ امّارہ کی ہے۔ بدی' پستی' گندگی' خباثت' اسی کے اندر وہ رہے گا۔ جیسے مکھی گندگی ہی پر بیٹھتی ہے' یہ بھی گندگی پر بیٹھے گا اور اگر مستقل طور پر اس کا رخ روح کی طرف ہو گیا تو اس کو قرآن کہتا ہے: نفس مطمئنہ۔ اب جو Id اور Libido ہے' وہ صرف sub-serve کرے گا' وہ زندگی کے بنیادی تقاضے پورے کرے گا' وہ کنٹرول ہو گا روح کے ذریعے۔ روح قلب کے ذریعے سے اسے کنٹرول کرے گی' اور جب یہ کیفیت ہو گی تو قرآن اسے نفس مطمئنہ کہتا ہے۔ وہ نفس مطمئن ہو گیا' اس لئے کہ روح کی وساطت سے اللہ کا قرب حاصل ہونے کے بعد اور اللہ کے ساتھ ایک باطنی ربط و تعلق قائم ہو جانے کے بعد جو اطمینان اور جو سکون حاصل ہوتا ہے اس کا اندازہ صرف اولیاء اللہ ہی کو ہو سکتا ہے۔ اس لئے کہ داخلی اطمینان و سکون یعنی inner tranquility تو

حاصل ہوتی ہی صرف ایمان کے ذریعے ہے۔ بہرحال اس جگہ پر اگر انسان پہنچا ہو تو وہ بحیثیت مجموعی نفس مطمئنہ قرار پاتا ہے۔ اور کس قدر پیارے الفاظ وارد ہوئے ہیں قرآن میں کہ نفس مطمئنہ کا جب انتقال ہوتا ہے تو اس وقت اللہ کی طرف سے پیغام آتا ہے :

﴿ يٰاَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ○ اِرْجِعِيْ اِلٰى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً○ فَادْخُلِيْ فِيْ عِبٰدِيْ○ وَادْخُلِيْ جَنَّتِيْ○ ﴾ (الفجر : ۲۷۔ ۳۰)

یعنی "اے نفس مطمئنہ! لوٹ جا اپنے رب کی طرف اس حال میں کہ وہ تجھ سے راضی اور تو اس سے راضی۔ اب میرے بندوں میں شامل ہو جا اور میری جنت میں داخل ہو جا!"

یہ دو انتہائی پوزیشنیں میں نے آپ کو بتائی ہیں۔ اگر قلب کا رخ مستقل Id اور Libido کی طرف ہے تو یہ پستی کا مکین انسان ہے' انسان غلط راستے پر جا رہا ہے۔ اگر مستقل طور پر قلب کا رخ روح کی جانب ہے تو یہ نفس مطمئنہ ہے ـــــ اور اگر معاملہ میرے اور آپ کا سا ہے' یعنی کچھ اِدھر کچھ اُدھر' فیصلہ کن طور پر نہ اِدھر نہ اُدھر' کبھی نفس کی طرف رُخ ہو گیا تو کوئی گری ہوئی حرکت کر بیٹھے' کبھی روح کی جانب رخ ہو گیا تو اچھا کام کر لیا' لیکن یہ کہ جب برا کام بھی کرتا ہے تو روح ملامت کرتی ہے اور from within your own self کوئی شے اسی طرح کی ملامت کرتی ہے کہ جیسے فیض نے نقشہ کھینچا ہے کہ ع :

"چھوٹی نہیں اپنوں سے کوئی طرزِ ملامت"

باہر سے کوئی دشنام ابھی آیا کہ نہیں آیا اور کسی ملامت گر کی طرف سے کوئی ملامت ہوئی یا نہیں ہوئی' خود آپ کے اندر سے آپ کی روح ملامت کر رہی ہے کہ تجھے اللہ نے کہیں اور کے لئے بنایا تھا' تو کدھر چلا گیا' تیرا مقام تو کچھ اور تھا! یہ تو کس گراوٹ میں مبتلا ہو گیا؟

اب میں اس سلسلے میں آپ سے ایک بہت اہم بات کر رہا ہوں علامہ اقبال کے حوالے سے۔ آپ کو معلوم ہے اُن کا فلسفۂ خودی مشہور ہے' اگرچہ شارحین کی مختلف شرحوں کی وجہ سے وہ چیستان بن گیا ہے۔ عام لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتا کہ خودی سے اصلاً مراد کیا ہے' لیکن یہ بہت پیارا واقعہ ہے جو سید نذیر نیازی مرحوم نے خود سنایا تھا۔ ہمارے ہاں ایک قرآن کانفرنس میں بیان کیا تھا اسی لئے ہم نے اسے چھاپ بھی دیا تھا۔ کہ

میں نے سوال کیا حضرت علامہ سے کہ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ آپ کا فلسفۂ خودی نطشے سے ماخوذ ہے' کچھ لوگ کسی اور فلسفی کا نام لیتے ہیں' آپ خود بتایئے کہ آپ کے فلسفہ خودی کا source کیا ہے۔ حضرت علامہ نے فرمایا کل آجانا' میں تمہیں dictate کرادوں گا۔ وہ کہتے ہیں کہ میں ساری رات اس خوشی سے سویا نہیں کہ یہ مفکرِ اسلام اور یہ عظیم فلسفی شاعر مجھے یہ مقام عطا فرما رہا ہے کہ وہ مجھے اپنے فلسفۂ خودی کے source کے حوالے سے dictate کرائیں گے!! چنانچہ وہ وقت مقررہ پر گئے' پنسل کاغذ تیار' گویا کیل کانٹے سے لیس' لیکن حضرت علامہ نے فرمایا : "اچھا ذرا وہ قرآن مجید نکالنا۔ انہوں نے خود کہا کہ میرے تمام ذوق و شوق پر اوس پڑ گئی' میں سمجھا تھا کہ کوئی فلسفے کی کتاب نکلوائیں گے' لیکن یہ تو قرآن مجید کی بات کر رہے ہیں۔ پھر فرمایا سورۃ الحشر نکالو' تیسرے رکوع کی دوسری آیت دیکھو : ﴿ وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ نَسُوا اللَّهَ فَأَنسَاهُمْ أَنفُسَهُمْ ... ﴾ (الحشر : ۱۹) یعنی "دیکھنا ایسے لوگوں کی مانند نہ ہو جانا جنہوں نے اللہ کو بھلا دیا تو اللہ نے انہیں اپنے آپ سے غافل کر دیا"۔ گویا اللہ کو بھلانے کی سزا فقط اس دنیا میں اپنے آپ سے غافل ہو جانا ہے۔ یہ "اپنا آپ" کون سا ہے؟ کیا انسان اپنے پیٹ سے غافل ہوتا ہے؟ کیا اپنی شہوت سے غافل ہوتا ہے؟ کیا اپنی ضروریات سے غافل ہوتا ہے؟ ذرا سی پھنسی کہیں نکل آئے تو دوڑ کر نہیں جاتا ڈاکٹر کے پاس؟ کس سے غافل ہوتا ہے؟ معلوم ہوا کہ آپ کے وجود کا یہ جو ظاہری پہلو ہے' اس کے علاوہ کوئی اور نفس ہے آپ کا' اس کے علاوہ کوئی اور حقیقت ہے آپ کی۔ اس کے لئے میں سادہ الفاظ میں سمجھایا کرتا ہوں کہ دیکھئے یہ جو "مَیں" ایک ضمیر ہے اور "میرا" اس کا possessive mood ہے' اس کا لازمی تقاضا ہے کہ "مَیں" میرے وجود سے ایک جداگانہ شے ہے۔ اس لئے کہ جب میں کہتا ہوں "میری عینک" تو عینک اور ہے اور مَیں اور ہوں۔ اسی طرح "میرا قلم" میں مَیں اور ہوں قلم اور ہے۔ جب کہا جائے کہ میرا جسم تو یہ "مَیں" کون ہے؟ میرے ہاتھ' میرے پاؤں' میرا سر' میرا پیٹ' میرے اعضاء' میرے جوارح' سب میرے ہیں۔ لیکن میں کون ہوں؟ وہ ہے انا' وہ ہے خودی۔ وہ اس جسم سے عبارت نہیں ہے۔ وہ بہت ارفع شے ہے' ماورائی شے ہے۔ وہ روح ہے۔ اب دیکھئے اس آیت کو کہ ان لوگوں کی مانند نہ ہو جانا کہ جنہوں نے خدا کو بھلا دیا تو خدا نے انہیں اپنے آپ سے غافل کر دیا۔ وہ

دراصل اپنی روح سے غافل ہو گئے۔ سب سے بڑا ظلم ڈارون نے یہی کیا کہ ہمیں یہ باور کرا دیا کہ ہم بھی بس ایک حیوان ہیں۔ slightly more evolved! جتنا فرق ہے گدھے میں اور گھوڑے میں کہ گھوڑا refined animal ہے' جبکہ گدھا بیچارہ ذرا coarse حیوان ہے' باقی کیا فرق ہے دونوں میں؟ اسی طرح چمپانزی یا گوریلا میں اور انسان میں کیا فرق ہے؟ وہ ذرا coarse ہے' ہم ذرا refined ہیں اور بس! گویا ہم مستعفی ہو چکے ہیں اپنی عظمت سے' اپنی انا سے' اپنی حقیقت سے' اپنے اصل وجود سے' اب انسان اپنے آپ کو صرف حیوان کہتا ہے۔ اکبر الہ آبادی نے اسی لئے بڑے مزاحیہ انداز میں کہا تھا ؎

کہا منصور نے خدا ہوں میں
ڈارون بولا بوزنا ہوں میں
ہنس کے کہنے لگے مرے اک دوست
فکرِ ہر کس بقدرِ ہمّتِ اوست

گویا منصور کی ہمت اور اولوالعزمی یہ تھی کہ اس نے خدا ہونے کا دعویٰ کیا اور ڈارون کی پست ہمتی اور دناءتِ طبع کا عالم یہ ہے کہ اپنے آپ کو بندر قرار دے رہا ہے۔ لیکن میں عرض کر چکا ہوں کہ ڈارون کو بھی میں بہت عظیم سائنس دان سمجھتا ہوں۔ یہ نہ سمجھئے کہ وہ کوئی عام آدمی تھا' لیکن مکمل صحیح فلسفہ صرف قرآن سے مل سکتا ہے' اور کہیں سے نہیں ملے گا' ورنہ آدمی ٹھوکریں کھائے گا' یا مشرق کی طرف یا مغرب کی طرف' یا ایک افراط کی طرف یا دوسری تفریط کی طرف۔

اب دیکھئے یہ حقیقت چونکہ Universal Truth کی حیثیت رکھتی ہے لہٰذا میں قرآن مجید کی سورۂ حشر کی اس آیت کا مفہوم اپنشد کے حوالہ سے آپ کو سناتا ہوں۔ اپنشد کا ایک اشلوک ہے۔ ذرا اس کا ترجمہ انگریزی میں ملاحظہ کیجئے :

"man in his "ignorance" identifies himself with the material sheaths which encompass his real self"

گویا "real self" کچھ اور ہے' اس کے گرد مادی غلاف ہیں۔ جیسے کپڑوں کے تھان آپ دیکھتے ہیں' اندر کوئی گتہ ہے یا کوئی اور لکڑی ہے جس کے اوپر کپڑا لپٹا ہوا ہوتا ہے'

ی طرح وہ ہمارا اندرونی وجود کچھ اور ہے جس کے اوپر یہ گوشت اور ہڈیاں ہیں اور ہماری کھال اور چربی کا غلاف اوڑھا دیا گیا ہے' اور یہ جہالت اور جاہلیت ہے کہ انسان اسی کو سمجھتا ہے کہ میں یہ ہوں۔ "man in his ignorance"۔ ایک زمانہ آپ کو یاد ہو گا وہ تھا جب امریکہ کی جان پر بنی ہوئی تھی' اس لئے کہ ادھر خلا کی تسخیر میں USSR بہت آگے نکل چکا تھا' اور اُدھر کمیونزم کا سیلاب آ رہا تھا اور امریکہ تھر تھر کانپ رہا تھا۔ وہ ہم سے کہتا تھا تم اپنا قرآن پڑھو بھائی' داس کیپیٹال (Das Capital) نہ پڑھو۔ قرآن پڑھو' وہ ہم تمہیں دیتے ہیں' چنانچہ امریکی حکومت نے "The Glorious Quran" لاکھوں کی تعداد میں مفت تقسیم کیا۔ اسی طرح گیتا اور اپنشد کے انتخاب پر مشتمل لاکھوں کاپیاں مفت تقسیم کیں۔ ہندوؤں سے کہا یہ پڑھو' گیتا پڑھو' اپنشد پڑھو' خواہ مخواہ کمیونسٹ لٹریچر کیوں پڑھتے ہو! اس زمانے میں مجھے اپنشد کا ایک ترجمہ مل گیا تھا' امریکہ کا تقسیم کردہ! میں نے دیکھا کہ اس میں بھی highest level پر وہی بات ہوئی ہے' اور بلند ترین سطح پر جو کچھ قرآن کہہ رہا ہے وہی اپنشد کہہ رہا ہے' بنیادی طور پر تو کوئی فرق نہیں ـــــ بہرحال اس حوالہ سے یہ تین levels ہیں۔ نفس امارہ (Id'Libido) یہ سب سے نچلی سطح ہے' دوسری انتہاء پر بلند ترین مقام پر Supper Ego کو رکھئے۔ یہ روح ہے ﴿قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّیْ﴾ کی رو سے Divine Matter اور Divine Affair ہے۔ اور درمیان میں قلب ہے' جو کبھی اِدھر کبھی اُدھر' کبھی ادھر کی دھڑکن ہے' کبھی ادھر کی دھڑکن ہے۔ اگر روح کی جانب یکسو ہو جائے تو وہ نفس مطمئنہ ہے۔

لیکن میں اب آخری بات پر اپنی گفتگو ختم کر رہا ہوں اور وہ یہ ہے کہ جیسے ہمارے اس lower being کے تقاضے ہیں۔ کھانا' پینا اور sexual urge اور بھی جتنے urges ہیں خواہ وہ Edler نے گنوائے ہیں یا کسی اور نے' وہ سب کے سب ٹھیک ہیں۔ اسے "حیوانیات" کہئے یا "نفسیاتِ حیوانیہ" جبکہ "نفسیاتِ روحانیہ" بجائے خود ایک جداگانہ علم ہے۔ روح کی urge کیا ہے؟ روح کی urge صرف ایک ہے اور وہ ہے "طلب حسن" لیکن اس حسن کے بہت سے لیول ہیں۔ بلند ترین حسن اور کامل ترین خوبی ذاتِ باری تعالیٰ ہے' حسن کامل' حسن ازل جس کا ایک پرتو خود ہمارے وجود میں روح

کی صورت میں موجود ہے۔ چنانچہ روح اللہ سے لو لگانا چاہتی ہے۔ ہر شے اپنے مرکز کی طرف لوٹتی ہے ؏

"اپنے مرکز کی طرف مائلِ پرواز تھا حسن!"

کے مصداق وہ اپنے مرکز کی طرف جانا چاہتی ہے۔ زمین کی شے زمین کی طرف جانا چاہتی ہے " وَلٰكِنَّهٗٓ اَخْلَدَ اِلَى الْاَرْضِ " جبکہ روح اللہ کی طرف جانا چاہتی ہے' یہ urge روح کی اصل urge ہے۔ لیکن بدقسمتی سے جو لوگ اللہ کو نہیں پہچان پاتے " مَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ " (الحج : ۷۴) وہ کسی کم تر شے کو خدا بنا کر پوجنا شروع کر دیتے ہیں' جیسے کوئی ideal' کوئی تصور' بقول شاعر ؎

اک تصور کے حسنِ معنیٰ پر
ساری ہستی لٹائی جاتی ہے
زندگی ترکِ آرزو کے بعد
کیسے سانسوں میں ڈھالی جاتی ہے

کوئی goal' کوئی Ideal' کوئی آدرش! غور طلب بات ہے کہ سب سے بڑا حیوانی داعیہ (animal instinct) تو preservation of the self ہے۔ گویا اپنی جان کو بچانا سب سے بڑا instinct ہو گا' لیکن کسی نظریے کی خوبصورتی آپ کو آمادہ کرتی ہے کہ آپ اپنے آپ کو اس پر قربان کر دیں۔ لاکھوں کمیونسٹوں نے اپنی جانوں کو قربان کیا یا نہیں کیا؟ فائرنگ سکواڈ کے سامنے آ کر جانیں دیں کہ نہیں دیں؟ سوال یہ ہے کہ ایسا کیوں ہے؟ اس لئے کہ انسان کے اندر تحفظ ذات سے بھی بڑھ کر بلند تر اور قوی تر urge موجود ہے ـــــ یہ جذبہ اور یہ امنگ درحقیقت اللہ تعالیٰ کی محبت کے لئے ہے ـــــ بقول علامہ اقبال "منزل ما کبریاست"۔ یعنی ہماری منزل خدا ہے' ہمارا آئیڈیل خدا ہے' خدا پرستی ہی ہمارا دین ہے ـــــ لیکن جب انسان خدا تک نہیں پہنچ پاتا تو کسی اور شے کو اس کی جگہ substitute کر دیتا ہے۔ چنانچہ خدا پرستی کی جگہ وطن پرستی' قوم پرستی' زر پرستی' شہوت پرستی' الغرض کسی نہ کسی کی پرستش لے لیتی ہے۔ یہ پرستش انسان کی فطرت میں ہے۔ وہ کسی کو پوجنا چاہتا ہے' کسی کے سامنے سر جھکانا' کسی سے دعا

کرنا چاہتا ہے' کسی کو اپنا سہارا ماننا چاہتا ہے' کسی پر توکّل کرنا چاہتا ہے' کسی کے لئے بھوکا رہنا چاہتا ہے' کسی کے لئے مرجانا چاہتا ہے' اگر کسی انسان میں یہ urge نہیں ہے تو وہ حیوان ہے۔ ﴿ اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ ﴾ (الاعراف : ۱۷۹) وہ خود زندگی نہیں گزارتے بلکہ زندگی انہیں گزارتی ہے' جب تک زندگی میں آپ کا کوئی آئیڈیل' کوئی آدرش' کوئی نصب العین نہیں ہے تو آپ حیوانی سطح پر زندگی گزار رہے ہیں۔ بلند ترین آدرش اور سب سے اونچا نصب العین ذاتِ باری تعالیٰ ہے ـــــ لیکن اگر کوئی شخص اللہ کے جمال و جلال کا اندازہ نہ کر سکے جیسا کہ اللہ کا اندازہ کرنا چاہئے تو وہ کسی ادنیٰ شے یا تصور کو اس کا قائم مقام تصور کر کے اسے پوجنا شروع کر دیتا ہے۔ اس لئے کہ اگر انسان اللہ کے جلال اور اس کے جمال کی کوئی جھلک دیکھ لے تو پھر وہ کسی اور شے یا کسی اور ہستی کی طرف مائل ہو ہی نہیں سکتا۔ یہ ہے روح کی urge اور اسی کے حوالے سے ہے علامہ اقبال کا فلسفہ خودی اور اس کی شرح' جو ڈاکٹر رفیع الدین مرحوم نے کی ہے۔ میں مشورہ دوں گا جو طلبہ اور طالبات یہاں موجود ہیں وہ ڈاکٹر رفیع الدین مرحوم کی "Ideology of the Future" نامی کتاب کا ضرور مطالعہ کریں۔ ہو سکتا ہے کہ آپ کے سامنے نفسیات کا' سائیکالوجی کا ایک بالکل نیا پہلو آ جائے۔ میں بہت ممنون ہوں منتظمین کا کہ انہوں نے یہ موقع مجھے دیا کہ آپ سے مخاطب ہو سکوں اور آپ سب کا بھی کہ آپ نے بڑے صبر اور سکون کے ساتھ میری باتیں سنی ہیں۔

اقول قولی هذا واستغفر اللّٰه لی ولکم ولسائر المُسلمین والمُسلمات○○

امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد کے بعض ذاتی اور مالی و معاشی کوائف پر مشتمل

حسابِ کم و بیش

کا نیا ایڈیشن جسے update کرنے کی خاطر امیر تنظیم کی چار صفحات پر مشتمل ایک تازہ تحریر "پس نوشت" اور نائب امیر کا تحریر کردہ مختصر "ضمیمہ" کا اضافہ کر دیا گیا ہے'

شائع کردہ : مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن' 36۔ کے' ماڈل ٹاؤن لاہور

علماءِ دیوبند کی دینی خدمات

تحریر: مولانا ڈاکٹر محمد امجد تھانوی

برصغیر میں تین تحریکوں کو بہت مقبولیت حاصل ہوئی:

۱) حضرت مجدد الف ثانیؒ کی تحریک ۱۵۶۲ء سے ۱۶۲۴ء تک۔

۲) شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ کی تحریک ۱۵۹۲ء سے ۱۶۱۴ء تک۔

۳) شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کی تحریک ۱۷۳۱ء سے ۱۸۴۶ء تک۔

لیکن ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی جس میں شاہ ولی اللہؒ کے سلسلے سے متعلق لوگوں نے ہراول دستے کا کردار ادا کیا تھا انہی کے شاگردوں نے اور ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے مجاہدین نے یہ طے کیا کہ تلوار سے جہاد کے بعد اب علمی جہاد شروع کیا جائے۔ اس سلسلے میں حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکیؒ کی زیر سرپرستی ۱۸۶۶ء میں ہندوستان کے ضلع سہارن پور کے ایک قصبے دیوبند میں دارالعلوم کا قیام عمل میں آیا' جس میں حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتوی' مولانا رشید احمد گنگوہی' حافظ ضامن صاحب شہید اور میاں جی نور محمد جھنجھانوی (رحمۃ اللہ علیہم) کے اثرات قائم اور دائم تھے۔ علمائے دیوبند نے اس بات پر توجہ دی کہ انگریز کو جلد از جلد برصغیر سے رخصت کیا جائے۔ اسی لئے سیاسی پلیٹ فارم پر جمعیت علمائے ہند نے ایک ہراول دستے کا کردار ادا کیا۔ دارالعلوم دیوبند کے بیشتر علماء دینی خدمات میں مصروف رہے اور تعلیم کے ساتھ تصنیف کا سلسلہ بھی جاری رکھا۔ انگریز کو نکالنے کے لئے دارالعلوم دیوبند کے مولانا حسین احمد مدنیؒ کی خدمات کو کبھی بھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ انہوں نے درس و تدریس کے ساتھ انگریز کے خلاف علم جہاد بلند کیا اور بڑے بڑے اکابر علماء نے ان کا ساتھ دیا۔

اسی زمانے میں حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ جن کو حکیم الاُمّت کے نام سے

یاد کیا جاتا ہے' انہوں نے اصلاحِ باطن کے سلسلے میں جو کام کیا اور ایک ہزار مختلف موضوعات پر کتابیں لکھیں' ان کا اس وقت دنیا کے کونے کونے میں نہ صرف ذکر موجود ہے بلکہ ان کے عقیدت مند ساری دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں۔ ان کے علاوہ بھی تصنیف و تالیف کے سلسلے میں دیوبند میں مولانا شبیر احمد عثمانی' مولانا ظفر احمد تھانوی' مفتی محمد شفیع' دارالعلوم دیوبند کے مفتی محمود' دارالعلوم دیوبند کے فرزند مولانا الیاس صاحب اور شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا (رحمۃ اللہ علیہم) کے نام قابل ذکر ہیں' بلکہ حقیقتاً ان کے نام سنہرے حروف میں لکھے جانے کے قابل ہیں۔ وعظ' تبلیغ' فتویٰ' جہاد اور دینی و ملکی معاملات برصغیر کی تاریخ میں دارالعلوم دیوبند کا ایک انتہائی قابل ذکر اور قابل تقلید کارنامہ ہے۔

قرآن کریم کی خدمات کے سلسلے میں ۲۹۶ علمائے دیوبند نے ۲۱ زبانوں میں قرآن کریم کے مکمل ترجمے کئے اور ۱۲۹ تفسیریں مکمل کیں۔ ان میں علامہ شبیر احمد عثمانیؒ کی تفسیر عثمانی' شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ کا ترجمہ و تفسیر' مولانا اشرف علی تھانویؒ کی بیان القرآن اور مولانا مفتی محمد شفیعؒ کی تفسیر مشہور و معروف ہیں۔ مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ کا جو کردار عیسائیت کے خلاف فتوحات میں رہا' جنہوں نے مکہ مکرمہ ہجرت کی' وہ بھی قابل ذکر ہے۔ مولانا عطاء اللہ شاہ بخاریؒ' مولانا محمد علی جالندھریؒ اور مولانا قاضی احسان احمد شجاع آبادیؒ کا جو ختم نبوت کے سلسلے میں کردار ہے اس سے نہ صرف برصغیر بلکہ پوری دنیا واقف ہے۔

اسی طرح علم حدیث کے سلسلے میں شیخ الحدیث مولانا محمد زکریاؒ نے موطا امام مالک کی پندرہ جلدوں میں شرح لکھی' بخاری کی شرح چار جلدوں میں مولانا انور شاہ کاشمیریؒ نے لکھی' ارشاد القاری کے نام سے ایک شرح مفتی رشید احمد صاحب نے لکھی' مولانا شبیر احمد عثمانی نے فضل الباری کے نام سے دو جلدوں میں شرح حدیث لکھی اور صحیح مسلم کی شرح بھی لکھی۔ مولانا احمد رضا بجنوری نے نو جلدوں میں بخاری شریف کا ترجمہ اور تشریح لکھی۔ ایک شرح مولانا رشید احمد گنگوہی' ایک مولانا اکرام علی اور مولانا خلیل احمد سہارن پوری نے لکھی۔ ۱۹۸۷ء میں مولانا یوسف بنوری نے سات جلدوں میں

شرح لکھی۔ مولانا محمد تقی عثمانی نے ترمذی شریف کی شرح لکھی۔ مولانا حسین احمد مدنی کی تقاریر ترمذی کو پانچ جلدوں میں ڈاکٹر حبیب اللہ مختار نے جمع کیا۔ مولانا مفتی نظام الدین نے درس ترمذی اور معارف ترمذی مکمل کی۔ مولانا عبدالرحمٰن کامل پوری اور مولانا محمود حسن نے نسائی شریف کا ترجمہ کیا اور اس کی تشریح ڈاکٹر فضل احمد نے دو جلدوں میں کی۔

اسی طرح علمائے دیوبند کے فرزند مولانا مفتی جمیل احمد تھانوی نے فتاویٰ کے سلسلے میں جو خدمات پاکستان میں انجام دی ہیں ان کا ذکر کیا جانا انتہائی ضروری ہے۔ مولانا مفتی محمود نے علمائے دیوبند کے کارناموں کا تسلسل جاری رکھتے ہوئے درس و تدریس کے علاوہ افتاء اور حدیث کے سلسلے میں اور علماء کی شخصیات کو پاکستان کے مختلف حلقوں میں بلند کرنے میں جو کردار ادا کیا ہے وہ بھی قابل ذکر ہے۔ مولانا عبدالقدوس ہاشمی، محمد حسین گنگوہی، مولانا عاشق الٰہی بلند شہری، مولانا خالد سیف اللہ، مفتی ولی حسن ٹونکی، مولانا محمد یوسف لدھیانوی، مولانا عبدالحق اکوڑہ خٹک، مفتی رشید احمد لدھیانوی، مفتی محمد حسن امرتسری، مولانا خیر محمد جالندھری، مولانا غلام اللہ خان، مولانا غلام غوث ہزاروی، مفتی عبدالسلام، مفتی عزیز الرحمٰن، سید عبدالرحیم اور مولانا خلیل احمد (رحمۃ اللہ علیہم) جیسے لوگوں کی فقہی خدمات کو علمائے دیوبند کے حوالے سے یاد رکھا جائے گا۔ ماضی قریب میں ہی حضرت مولانا احتشام الحق تھانوی، جانشین شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانی کی علمی و دینی بین الاقوامی خدمات کو نہ صرف خراجِ تحسین پیش کیا جائے گا بلکہ ان کو ہمیشہ علمائے دیوبند کے ترجمان کے نام سے یاد کیا جائے گا۔

آج انہی کے جانشینوں میں علمی، تدریسی، دینی اور مدارس کے حوالے سے مولانا مفتی محمد رفیع، مولانا سلیم اللہ خان، مولانا اسفندیار خان، مولانا عبدالرحمٰن اشرفی، مولانا عبید اللہ، جامعہ اشرفیہ لاہور، مولانا محمد تقی عثمانی، مولانا مشرف علی تھانوی لاہور، مولانا محمد اسعد تھانوی جامعہ اشرفیہ سکھر، مرحوم مولانا زکریا، مرحوم مولانا مفتی احمد الرحمٰن، مولانا محمد حنیف جالندھری ملتان، مولانا عبدالقادر آزاد لاہور، مولانا عبدالستار رحمانی، مولانا عاجیجوی، مولانا فضل الرحمان ٹیڑھی سندھ، سینئر حافظ حسین احمد، مولانا یوسف قریشی پشاور،

سجادہ نشین امروٹ شریف' مولانا عبدالستار رحمانی ڈیرہ غازی خان' مولانا حافظ غلام حبیب رحیم چکوال' مرحوم مولانا عبدالحکیم راولپنڈی' مرحوم مولانا عبداللہ اسلام آباد' مولانا محمد آصف قاسمی ان تمام حضرات کی دینی خدمات اور درس وتدریس' دینِ اسلام کے لئے جدّوجُہد اور کوشش علمائے دیوبند کی جدوجہد اور کاوش کا نتیجہ ہے۔

علماءِ دیوبند نے جہاں مذہبی' علمی اور سیاسی خدمات انجام دی ہیں وہاں ان کی ادبی خدمات بھی موجود ہیں' جن میں مناظر احسن گیلانی' تاجدار نجیب آبادی' سعید احمد اکبر آبادی' حامد الانصاری' مظہر الدین شیرکوٹی اور انور صابری قابل ذکر ہیں۔ ان تمام حضرات نے جو فرزندانِ دیوبند کہلانے پر فخر محسوس کرتے تھے' ادبی لحاظ سے شاعری اور اردو کی خدمات انجام دیں جس کو دنیا کے تمام ممالک میں تسلیم کیا جاتا ہے۔

علمائے دیوبند کی خدمات کے اعتراف میں اور قیام پاکستان کے سلسلے میں مولانا شبیر احمد عثمانی اور مولانا ظفر احمد تھانوی کو نمائندہ دیوبند سمجھ کر بانی پاکستان قائداعظم محمد علی جناح اور ان کے تمام ساتھیوں نے متفقہ طور پر یہ فیصلہ کیا تھا کہ مولانا شبیر احمد عثمانی مغربی پاکستان میں اور مولانا ظفر احمد تھانوی مشرقی پاکستان میں پاکستان کا جھنڈا لہرا کر قیام پاکستان کا اعلان کریں گے۔ حتیٰ کہ بانی پاکستان قائداعظم محمد علی جناح نے مولانا شبیر احمد عثمانی کی مرتب کردہ اسلامی دفعات کو آئین کا حصہ بنایا جو آج بھی پاکستان کے آئین کا حصّہ ہیں اور جب تک پاکستان قائم ہے اسے آئین سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔ قائداعظم محمد علی جناح کی نمازِ جنازہ کی امامت مولانا شبیر احمد عثمانی نے کی۔

ان تمام حقائق کے ساتھ وفاق المدارس العربیہ کے نام سے ہزاروں کے حساب سے دینی مدارس اور لاکھوں کے حساب سے طلبہ علمائے دیوبند کے ایک سپاہی کی حیثیت سے مصروف عمل ہیں۔ یہ حقائق ہی علمائے دیوبند کی خدمات کو اجاگر کرنے کے لئے کافی ہیں۔ جب تک دین اسلام باقی ہے علمائے دیوبند کی دینی' علمی اور اصلاحی خدمات کا تسلسل جاری رہے گا۔ مولانا اشرف علی تھانوی کے ان تمام خلفاء کو جنہوں نے پوری دنیا کے اندر علمی' دینی اور اصلاحی نظام قائم کیا ان کو بھی علمائے دیوبند کے حوالے سے خراج تحسین پیش کیا جائے گا۔

توحید پر ایمان اور شرک سے بیزاری ہی صراطِ مستقیم ہے

آیاتِ قرآنیہ کی روشنی میں

انتخاب و ترتیب: حافظ محمد سلیمان

۱) قیامت کے دن مجرموں کو علیحدہ کھڑا کر کے پوچھا جائے گا کہ کیا انہیں یہ نہیں بتایا گیا تھا کہ صرف ایک اللہ تعالیٰ کی بندگی کرنا ہی صراطِ مستقیم ہے!

﴿وَامْتَازُوا الْيَوْمَ أَيُّهَا الْمُجْرِمُونَ ۝ أَلَمْ أَعْهَدْ إِلَيْكُمْ يَا بَنِي آدَمَ أَنْ لَا تَعْبُدُوا الشَّيْطَانَ ۖ إِنَّهُ لَكُمْ عَدُوٌّ مُبِينٌ ۝ وَأَنِ اعْبُدُونِي ۚ هَٰذَا صِرَاطٌ مُسْتَقِيمٌ ۝﴾ (یٰسٓ: ۵۹ ـ ۶۱)

''اور اے مجرمو! آج تم چھٹ کر الگ ہو جاؤ۔ اے بنی آدم! کیا میں نے تم کو ہدایت نہ کی تھی کہ شیطان کی بندگی نہ کرو، وہ تمہارا کھلا دشمن ہے اور میری ہی بندگی کرو، یہ سیدھا راستہ ہے۔''

۲) حضرت ابراہیم علیہ السلام جو یہودیوں، عیسائیوں اور مسلمانوں کے مشترکہ رہنما ہیں، کبھی مشرک نہ تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو (توحید کا) صراطِ مستقیم دکھا دیا تھا۔

﴿إِنَّ إِبْرَاهِيمَ كَانَ أُمَّةً قَانِتًا لِلَّهِ حَنِيفًا ۖ وَلَمْ يَكُ مِنَ الْمُشْرِكِينَ ۝ شَاكِرًا لِأَنْعُمِهِ ۖ اجْتَبَاهُ وَهَدَاهُ إِلَىٰ صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ ۝﴾

(النحل: ۱۲۰، ۱۲۱)

''واقعہ یہ ہے کہ ابراہیم (علیہ السلام) اپنی ذات میں ایک پوری امت تھا، اللہ کا مطیع فرمان، یکسو اور وہ کبھی مشرک نہ تھا۔ اللہ کی نعمتوں کا شکر ادا کرنے والا تھا۔ اللہ نے اس کو منتخب کر لیا اور سیدھا راستہ دکھایا۔''

۳) حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنی امت کو واشگاف الفاظ میں یہ حقیقت بتا دی کہ اللہ تعالیٰ ہی سب کا ربّ ہے اور صرف اسی کی عبادت کرنا ہی صراطِ مستقیم ہے۔

﴿ولَمَّا جآءَ عِيسٰى بِالْبَيِّنٰتِ قَالَ قد جِئْتُكُمْ بِالْحِكْمَةِ وَلِاُبَيِّنَ لَكُمْ بَعْضَ الَّذِىْ تَخْتَلِفُوْنَ فِيْهِ ۚ فَاتَّقُوا اللّٰه واَطِيْعُوْنِ ○ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ رَبِّىْ وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ ؕ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ○﴾ (الزخرف: ٦٣، ٦٤)

''اور جب عیسیٰ (علیہ السلام) صریح نشانیاں لئے ہوئے آیا تھا تو اس نے کہا تھا کہ:
''میں تم لوگوں کے پاس حکمت لے کر آیا ہوں' اور اس لئے آیا ہوں کہ تم پر بعض اُن باتوں کی حقیقت کھول دوں جن میں تم اختلاف کر رہے ہو، لہٰذا تم اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ ہی میرا ربّ بھی ہے اور تمہارا بھی۔ اسی کی تم عبادت کرو' یہی سیدھا راستہ ہے۔''

۴۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ارشاد فرمایا گیا کہ وہ برملا یہ اعلان کر دیں کہ جس صراطِ مستقیم کی اُن کو نشان دہی کی گئی ہے (وہ کوئی نئی نہیں ہے) وہ تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کا طریقہ ہے اور وہ مشرک نہیں تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ بھی فرمایا گیا کہ اعلان کر دیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تمام عبادتیں اور جینا اور مرنا سب کچھ اللہ ربُّ العالمین کے لئے ہے جس کا کوئی شریک نہیں ہے۔

﴿قُلْ اِنَّنِىْ هَدٰنِىْ رَبِّىْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۚ دِيْنًا قِيَمًا مِّلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا ۚ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ○ قُلْ اِنَّ صَلَاتِىْ وَنُسُكِىْ وَمَحْيَاىَ وَمَمَاتِىْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ○ لَا شَرِيْكَ لَهٗ ۚ وَبِذٰلِكَ اُمِرْتُ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِيْنَ○﴾ (الانعام: ١٦٢-١٦٤)

''اے نبیؐ! کہو میرے ربّ نے بالیقین مجھے سیدھا راستہ دکھا دیا ہے' بالکل ٹھیک دین جس میں کوئی ٹیڑھ نہیں، ابراہیم (علیہ السلام) کا طریقہ جسے یکسو ہو کر اس نے اختیار کیا تھا اور وہ مشرکوں میں سے نہ تھا۔ کہو، میری نماز' میرے تمام مراسم عبودیت، میرا جینا اور میرا مرنا سب کچھ اللہ ربُّ العالمین کے لئے ہے۔ جس کا کوئی شریک نہیں۔ اسی کا مجھے حکم دیا گیا ہے اور سب سے پہلے سرِ اطاعت جھکانے والا میں ہوں۔''

۵۔ اللہ تعالیٰ نے مشرکوں سے براہِ راست ایک سیدھا سا سوال کیا ہے کہ رحمٰن کے مقابلے میں ان کی مدد کون کر سکتا ہے؟ کون ہے کہ رحمٰن رزق روک دے تو وہ اُن مشرکوں کو رزق دے۔ اور کیا وہ (مشرک) اچھا ہے جو مُنہ اوندھا کیے ہوئے چل رہا ہے یا وہ (موحّد) اچھا ہے جو سر اٹھائے ہوئے (توحید کے) صراطِ مستقیم پر چلتا ہے۔

ہ اَمَّنْ هٰذَا الَّذِیْ هُوَ جُنْدٌ لَّكُمْ یَنْصُرُكُمْ مِّنْ دُوْنِ الرَّحْمٰنِ ؕ اِنِ الْكٰفِرُوْنَ اِلَّا فِیْ غُرُوْرٍ ۝ اَمَّنْ هٰذَا الَّذِیْ یَرْزُقُكُمْ اِنْ اَمْسَكَ رِزْقَهٗ ؕ بَلْ لَّجُّوْا فِیْ عُتُوٍّ وَّنُفُوْرٍ ۝ اَفَمَنْ یَّمْشِیْ مُكِبًّا عَلٰی وَجْهِهٖۤ اَهْدٰۤی اَمَّنْ یَّمْشِیْ سَوِیًّا عَلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ ۝ (الملک: ۲۰ تا ۲۲)

''بتاؤ' آخر وہ کون سا لشکر تمہارے پاس ہے جو رحمٰن کے مقابلے میں تمہاری مدد کر سکتا ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ یہ منکر دھوکے میں پڑے ہوئے ہیں۔ یا پھر بتاؤ کون ہے جو تمہیں رزق دے سکتا ہے اگر رحمٰن اپنا رزق روک لے؟ دراصل یہ لوگ سرکشی اور حق سے گریز پر اڑے ہوئے ہیں۔ بھلا سوچو، جو شخص منہ اوندھائے چل رہا ہو وہ زیادہ صحیح راہ پانے والا ہے یا وہ جو سر اٹھائے سیدھا ایک ہموار سڑک پر چل رہا ہو۔''

امیر تنظیم اسلامی **محترم ڈاکٹر اسرار احمد** کی نئی کتاب

اسلام میں عدل اجتماعی کی اہمیت'
اور موجودہ جاگیرداری اور غیر حاضر زمینداری
کے خاتمے کی صورت

عمدہ سفید کاغذ ـــــ کمپیوٹر کمپوزنگ ـــــ صفحات ۴۸ ـــــ قیمت: ۱۲ روپے

ملنے کا پتہ: مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن' ۳۶۔ کے ماڈل ٹاؤن لاہور فون: ۵۸۶۹۵۰۱-۰۳

اسلامی تحقیق کا مفہوم، مدّعا اور طریق کار (۲)

ہمارے تحقیق اسلامی کے اداروں کے سامنے کرنے کا اصل کام

تحریر : ڈاکٹر محمد رفیع الدین مرحوم

اسلامی تحقیق کا کام ہمارے لئے زندگی اور موت کا سوال ہے

اقوامِ عالم ایک باہمی جنگ میں مصروف ہیں جو کبھی پُر امن ہوتی ہے اور کبھی تشدد آمیز، لیکن ہمیشہ ہمیشہ جاری رہتی ہے۔ اس جنگ میں نظریات اور تصورات کی قوت ہی فیصلہ کن ثابت ہوگی۔ جو قوم اس جنگ میں فتح یاب ہو کر بالآخر دنیا کے کناروں تک پھیل جائے گی اور پھر ہمیشہ وہاں موجود رہے گی، وہ وہ نہیں ہوگی جس کے پاس جوہری آلات زیادہ ہوں گے، بلکہ وہ ہوگی جس کے نظریہ حیات کے تصورات سب سے زیادہ معقول اور مدلّل اور دلکش اور دل نشیں ہوں گے۔ جو قوم نظریاتی محاذ پر اپنی حفاظت نہیں کرتی وہ محض فوجی محاذ پر طاقتور بن کر اپنے آپ کو بچا نہیں سکتی۔ اور جو قوم نظریاتی محاذ پر طاقتور بن جائے اسے کسی فوجی محاذ کی ضرورت نہیں رہتی۔ اپنی زندگی کے اس نازک دور میں جب ہم دوسری قوموں کے نظریات کی طرف سے اپنی بقاء کے لئے ایک خطرناک چیلنج کا سامنا کر رہے ہیں، ہم ایک نظریاتی قوم کی حیثیت سے صرف اسی صورت میں زندہ رہ سکتے ہیں جب ہم اسلام کی ایک نہایت ہی معقول اور مدلل سائنسی توجیہہ پیش کریں۔ ہماری خوش قسمتی ہے کہ تمام معقول اور دلکش سائنسی تصوّرات کا سرچشمہ توحید کا عقیدہ ہے جو اپنی صحیح اور پاکیزہ صورت میں فقط مسلمان قوم ہی کے پاس ہے۔ یہی وہ عقیدہ ہے جو اسلام کی روح ہے اور انسان اور کائنات کے صحیح اور سائنسی نظریہ کی صورت اختیار کر سکتا ہے۔ ہمارا فرض ہے کہ ہم تحقیق و تجسس کی تمام قوتوں کو بروئے کار لا کر اسلامی تعلیمات کو ایک ایسے سائنسی نظریۂ کائنات کی شکل دیں جس سے انکار کی گنجائش موجود نہ رہے۔

ہمارے اسلامی تحقیق کے تمام اداروں کو اس اہم کام کی طرف متوجہ ہونا چاہئے۔

اسلامی تحقیق ہمارے لئے کوئی غیر ضروری تفریحی مشغلہ نہیں جسے ہم اپنی فرصت یا سہولت کے مطابق اختیار کریں بلکہ ہماری زندگی اور موت کا سوال ہے۔ اگر ہم اس کی طرف بروقت اور پوری تن دہی کے ساتھ متوجّہ نہ ہوئے تو ہمیں یقینی موت کا منتظر رہنا چاہئے اور پھر ہمارے بعد خدا کوئی اور قوم پیدا کرے گا جو اسلام کا یہ کام کرے گی۔

ہم اپنے آپ کو غلط نظریات کا معتقد بننے سے کیونکر بچا سکتے ہیں!

اس دَور میں یہ حقیقت پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ افکار اور تصورات قوموں کو مفتوح اور مغلوب کرنے والی ایک قوّت کی حیثیت سے افواج اور اسلحہ کی تمام قسموں سے زیادہ مؤثر ہیں چونکہ وہ لاسلکی پر بھی سفر کر سکتے ہیں۔ وہ افواج اور اسلحہ سے بہت زیادہ سریع الحرکت ہیں۔ اور پہاڑوں' دریاؤں' سمندروں اور صحراؤں کی جغرافیائی رکاوٹیں' بین الاقوامی سیاسی سرحدیں' سیگفریڈ اور میجینو ایسی فوجی مدافعتی قلعہ بندیاں ان کی یلغار کو روک نہیں سکتیں۔ ہر ریاست ایک منظم نظریاتی جماعت ہوتی ہے' جو اپنے پریس' پلیٹ فارم' ریڈیو' سینما اور ٹیلی ویژن کے ذریعہ سے اور اپنی مطبوعات اور دوسرے ملکوں میں قائم کئے ہوئے اطلاعاتی مرکزوں اور کتب خانوں کی مدد سے اپنے نظریہ کی معقولیت اور دلکشی کو ثابت کرنے والے تصورات کی اشاعت کرتی رہتی ہے تاکہ دوسری قوموں کو ذہنی اور نفسیاتی طور پر مفتوح اور مغلوب کرے۔ وہ نظریاتی جماعت جو دوسری نظریاتی جماعتوں کو اپنے تصورات سے مفتوح و مغلوب کرنے کی کوشش نہیں کرتی' اس بات کا خطرہ مول لیتی ہے کہ زود یا بدیر دوسری نظریاتی جماعتیں اُسے مفتوح اور مغلوب کر کے ہمیشہ کے لئے صفحۂ ہستی سے مٹا دیں گی۔ حقیقت حال یہ ہے کہ نظریات کی اس جنگ کے میدان کے عین وسط میں موجود ہونے کے باوجود ہم عرصۂ دراز سے نہ دوسروں کو اپنے تصورات سے متاثر کرنے کی کوشش کر رہے ہیں اور نہ دوسروں کے تصورات کے بالمقابل اپنی مدافعت اور حفاظت کر رہے ہیں' بلکہ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ ہم اس بات کے بہت قریب پہنچ گئے ہیں کہ ہم دوسری قوموں کے تصورات سے ذہنی طور پر مفتوح اور مغلوب ہو کر مسلمان قوم کی حیثیت سے نیست و نابود ہو جائیں۔ ظاہری طور پر ہم مسلمان ہیں لیکن ہم میں سے بیشتر ایسے ہیں جن

کے دلوں میں اسلام کی بجائے دوسرے نظریات کی محبّت متمکّن ہے۔

جس نسبت سے ہم دوسرے تصورات اور نظریات کی طرف مائل ہوتے جارہے ہیں اسی قدر اسلام سے دور ہوتے جارہے ہیں۔ بداخلاقی' فریب کاری' بے حیائی' رشوت ستانی' خود پرستی' جَنبہ داری' خاندان پرستی' صوبہ پرستی' چور بازاری' نفع اندوزی اور دوسری بری خصلتیں' جو ہمارے معاشرہ میں روزافزوں ترقی پر ہیں اور جن پر ہم میں سے بعض اچھے لوگ اظہار افسوس کرتے رہتے ہیں' سب اس بات کی علامت ہیں کہ اسلام پر ہمارا ایمان مضمحل ہوتا جارہا ہے۔ اسلام کے متعلق ہمارے افہام پراگندہ اور ہمارے خیالات پریشان ہیں اور ہم یہ جاننے سے قاصر ہیں کہ اسلام ہم سے کیا چاہتا ہے' کس قسم کی عملی زندگی کا مطالبہ کرتا ہے' اور کیوں! غلط نظریات اور تصورات کی دھند اس طرح چھائی ہوئی ہے کہ ہمیں اپنا راستہ صاف طور پر نظر نہیں آتا۔ ان حالات میں کئی خود ساختہ رہبرانِ قوم' جو غیر اسلامی نظریات کے دام میں دوسروں سے کم گرفتار نہیں' اسلام کی نئی تشریح کرنے کے لئے سامنے آگئے ہیں۔ گویا وہ اپنی غیر معمولی خداداد ذہانت اور قابلیت سے اسلام کو اس کی موجودہ مشکلات سے نجات دے کر مسلمانوں پر احسان کرنا چاہتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ اسلام کی کئی متضاد قسم کی توجیہات وجود میں آگئی ہیں جن سے ہماری پراگندہ خیالی اور بڑھ رہی ہے اور اس اسلام پر ہمارا ایمان اور کمزور ہوتا جارہا ہے جس پر تاریخ کی ناقابل انکار شہادتوں کے مطابق حضور ﷺ اور صحابہ رضی اللہ عنہم نے عمل کیا تھا۔

اس صورت حال نے بعض مخلص مسلمانوں کو بڑا پریشان کردیا ہے اور وہ اس بات کی کوشش کررہے ہیں کہ اسلام سے بھٹکنے والے مسلمانوں کو خدا اور رسول اور قرآن کا واسطہ دے کر اسلام کی طرف واپس لایا جائے۔ لیکن ان کی کوششوں کے باوجود یہ مسلمان اسلام سے روز بروز دور تر ہوتے جارہے ہیں۔ یہ کوششیں' جو درحقیقت بے یقین مسلمانوں کی مشکلات سے بے خبری پر مبنی ہیں' کبھی کامیاب نہیں ہوسکتیں۔ ہمیں اس بات کو واضح طور پر سمجھ لینا چاہئے کہ وہ مسلمان جو اسلام پر اپنا یقین کھو بیٹھتا ہے وہ اپنے افکار و تصورات غیر اسلامی نظریات سے عقل اور علم اور دانش اور سائنس اور فلسفہ کے دلفریب ناموں کے ساتھ مستعار لیتا ہے۔ لہٰذا جب تک ہم اسلامی تحقیق کے

ذریعہ سے ایسا علمی اور عقلی ذخیرہ پیدا نہ کریں جو اس کے غیر مسلم استاد کو اسلام کے حق میں پوری طرح سے متاثر کر سکے، ناممکن ہے کہ ہم اس کو اسلام کی طرف واپس بلا سکیں۔

غیر مسلم کو اسلام کا معتقد بنانے کا طریقہ

لیکن ایک غیر مسلم کے سامنے اسلام پیش کرنے کا طریق اس سے بہت مختلف ہے جو ایک مسلمان فرد کے لئے کام میں لایا جا سکتا ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک معلم یا مبلغ کی حیثیت سے ہمارے لئے ضروری ہے کہ ہم مخاطب کے معلوم سے آغاز کر کے اس کے نامعلوم کی طرف آئیں۔ اور ظاہر ہے کہ ایک مسلمان کا معلوم ایک غیر مسلم کے معلوم سے بہت مختلف ہے۔ مثلاً ایک مسلمان جانتا ہے کہ قرآن حکیم خدا کی نازل کی ہوئی سچی کتاب ہے، ایک غیر مسلم یہ نہیں جانتا۔ وہ صرف قدرت کے ان حقائق اور قوانین کو ہی جانتا ہے جو وہ قدرت کے مشاہدہ اور مطالعہ سے معلوم کر سکتا ہے۔ اور ہم اس کو اسلام کی دعوت دیتے ہوئے فقط ان ہی حقائق اور قوانین کو بطور دلائل کے پیش کر سکتے ہیں۔

اسلام کی تبلیغ کا یہ طریق نیا نہیں بلکہ یہ طریق بعینہٖ وہی ہے جو خود قرآن حکیم نے اختیار کیا ہے۔ کیونکہ قرآن حکیم منکرین کو بار بار اس بات کی دعوت دیتا ہے کہ وہ خدا پر ایمان لانے کے لئے مظاہر قدرت کا مشاہدہ اور مطالعہ کریں، جہاں ان کو خدا کی ہستی اور صفات کے واضح نشانات نظر آئیں گے۔ اور ایسے حقائق کی بنا پر خدا کی نازل کی ہوئی کتاب ہونے کا مدعی ہے جو قدرت کے مشاہدہ اور مطالعہ سے دریافت کئے جا سکتے ہیں۔ بلکہ قرآن حکیم اس بات کی پیش گوئی کرتا ہے کہ خدا مستقبل میں خارجی دنیا اور نفس انسانی سے تعلق رکھنے والے ایسے حقائق کو آشکار کرے گا جن کی روشنی میں منکرین یہ تسلیم کرنے پر مجبور ہوں گے کہ قرآن خدا کی سچی کتاب ہے۔ اب یہ بات مسلّم ہے کہ سائنس اور سائنسی طریق تحقیق یعنی مظاہرِ قدرت کا علم اور اس کے حصول کے طریق کے موجد مسلمان تھے۔ ظہور اسلام کے بعد مسلمان سائنس دانوں کے ذریعہ سے مشاہدۂ قدرت کی ضرورت کے بارہ میں قرآن کی راہ نمائی سے مستفید ہو کر اب ایک عرصہ سے مغرب کے لوگ مظاہر قدرت کا تفصیلی اور تحقیقی مطالعہ کرتے رہے ہیں۔ ان لوگوں نے اب ایسے حقائق کا ایک بہت بڑا ذخیرہ جمع کر لیا ہے جو مظاہرِ قدرت کے علم سے تعلق رکھتے ہیں اور

ان حقائق کو انہوں نے کئی منظم علوم کی صورت میں مرتّب کیا ہے جن کے مجموعہ کو سائنس کہا جاتا ہے۔ قدرت کے جو حقائق مادہ، حیوان اور انسان سے تعلق رکھتے ہیں ان کو بالترتیب طبیعیات، حیاتیات اور نفسیات کا نام دیا گیا ہے۔

غیر مُسلموں کی کوتاہی

مغرب کے غیر مسلموں نے بے شک مظاہر قدرت کے علم سے تعلق رکھنے والے بہت سے حقائق کو بڑی احتیاط اور محنت سے دریافت کر کے مختلف علوم کی صورت میں مرتب کر لیا ہے لیکن بد قسمتی سے وہ یہ نہ سمجھ سکے کہ ان حقائق کا حقیقت کائنات کے ساتھ اور لہٰذا ایک دوسرے کے ساتھ کیا تعلق ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ وہ حقائق کسی عقلی اور علمی ربط کے بغیر ایک دوسرے سے الگ تھلگ پڑے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اہل مغرب اور مظاہر قدرت کے علم کے متعلق ان کے نقطۂ نظر سے متاثر ہونے والی قوموں کے نصب العینوں یا نظریاتِ حیات یا نظام ہائے حکمت کے اندر اس قدر اختلاف موجود ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس حقیقت کو بالعموم درست سمجھا جاتا ہے کہ مظاہر قدرت کے علم سے تعلق رکھنے والے حقائق، جن کو عام فہم زبان میں سائنسی حقائق کہا جاتا ہے، عقلی اور علمی نقطۂ نظر سے حقیقتِ کائنات کے ساتھ مطابقت رکھتے ہیں اور ہر نظامِ حکمت اس کوشش سے عبارت ہوتا ہے کہ حقیقت کائنات کے ساتھ ان کے اس تعلق کو جو نظامِ حکمت کے مُوجد کی سمجھ میں آتا ہے واضح کیا جائے اور استدلال کی قوت سے پایۂ ثبوت کو پہنچایا جائے۔

دوسرے لفظوں میں ہر نظامِ حکمت اس کوشش سے صورت پذیر ہوتا ہے کہ سائنسی حقائق کو ان کے علمی اور عقلی ربط و ضبط کے ساتھ منظم کیا جائے۔ ایک نصبُ العین، حقیقت کائنات اور اس کے اوصاف و خواص کا ایک تصور ہوتا ہے۔ ایک نظریۂ حیات، ایک مجموعۂ تصوّرات ہوتا ہے جو کسی نصب العین سے ماخوذ ہوتے ہیں، خواہ وہ عقلی اور علمی لحاظ سے منظم ہوں یا نہ ہوں۔ لیکن ایک نظامِ حکمت یا فلسفہ ایسے تصورات کا ایک سلسلہ ہوتا ہے جو کسی نصب العین کے ماتحت عقلی اور علمی لحاظ سے مربوط اور منظم کئے گئے ہوں۔

فلسفی کا طریق کار

فلسفی کو سب سے پہلے حقیقت کائنات کے متعلق ایک وجدان یا ایقان یا مشاہدہ حاصل ہوتا ہے، جو اس کے معلوم حقائق پر اس کے غور و فکر کا نتیجہ ہوتا ہے، اور اس کے خیال میں ان حقائق سے مطابقت رکھتا ہے۔ پھر وہ کوشش کرتا ہے کہ حقیقتِ کائنات کے اس وجدانی تصور کے ساتھ معلوم حقائق کے علمی اور عقلی تعلق یا ربط کی وضاحت کرے۔ اس کوشش کے ذریعہ سے وہ دراصل اپنے وجدانی تصورِ حقیقت کی عقلی توجیہہ کرتا ہے اور یہی توجیہہ اس کا فلسفہ کہلاتی ہے۔ اگر اس کا وجدانی تصورِ حقیقت غلط ہوگا تو اس تصوّر کی عقلی توجیہہ بھی غلط ہوگی اور اس کے افکار و تصوّرات کی عقلی ترتیب اور منطقی تنظیم کے اندر جا بجا ناہمواریاں اور نادرستیاں ابھر آئیں گی، اور رخنے اور جھول پیدا ہو جائیں گے، جن کو یا تو وہ نظرانداز کرے گا یا اپنے دلائل کے پردہ میں چھپانے کی کوشش کرے گا۔

اس قسم کے رخنوں اور جھولوں کا ظہور انسانی اور اجتماعی علوم میں مثلاً نفسیاتِ فرد و جماعت میں اور سیاسیات، اخلاقیات، اقتصادیات، تعلیمات، فن قانون اور تاریخ کے فلسفوں میں سب سے زیادہ نمایاں ہوتا ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ علوم براہ راست فلسفی کے نظریۂ حقیقت پر، جس میں نظریہ انسانی بھی شامل ہے، مبنی ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ (جیسا کہ حکمائے مغرب خود تسلیم کرتے ہیں) مغرب میں نشو و نما پانے والے انسانی اور اجتماعی علوم میں ایک شدید قسم کا منطقی اور عقلی انتشار پایا جاتا ہے اور جب صورت حال یہ ہو کہ ایک طرف سے انسان کی حقیقت روحانی توجیہہ کا تقاضا کرتی ہو اور دوسری طرف سے انسانی اعمال اور افعال کے مغربی حکماء انسان کی میکانکی اور مادی توجیہہ پر مُصر ہوں تو پھر کیسے ممکن ہے کہ مغرب میں پروان چڑھنے والے انسانی اور اجتماعی علوم میں انتشار موجود نہ ہو۔ اس کے برعکس اگر فلسفی کا وجدانی تصورِ حقیقت درست ہوگا تو اس تصور کی عقلی توجیہہ کی کوشش کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تمام علمی حقائق آسانی کے ساتھ ایک دلکش تنظیم اختیار کر لیں گے اور ایک مکمل نظامِ حکمت کے اندر ایک ایسی مکمل منطقی ترتیب کے ساتھ آراستہ ہو جائیں گے جس میں کوئی رخنہ یا جھول موجود نہیں ہوگا۔

ہمارے اسلامی تحقیق کے اداروں کے سامنے کرنے کا کام

یہ معلوم کر لینے کے بعد کہ صرف حقیقت کائنات کا صحیح تصور ہی کسی صحیح فلسفہ کی بنیاد بن سکتا ہے اور ایک فلسفی کے لئے اس کا ہونا یہاں تک ضروری ہے کہ اس کے بغیر اس کا سارا کام ناقص اور لغو اور بے کار ہو کر رہ جاتا ہے' یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ فلسفی حقیقت کائنات کا یہ صحیح تصور کہاں سے لائے اور کیسے حاصل کرے۔ خدا نے فلسفی کی اس شدید ضرورت کا سامان کارخانہ قدرت کے اندر بلا قیمت اور ایک گراں قدر عطیہ کے طور پر خود بخود مرحمت فرما دیا ہے اور وہ نبیؐ کامل' صاحب قرآن' جناب محمد مصطفیٰ ﷺ کا تصورِ حقیقت ہے جسے آپؐ کا ہر مخلص پیرو آپؐ کی محبت اور اطاعت کے ذریعہ سے اپنا بنا سکتا ہے۔ ہمارے تمام اسلامی تحقیق کے اداروں کے سامنے کرنے کا اہم کام یہ ہے کہ وہ دنیا کے سامنے یہ ثابت کریں کہ کائنات کے طبیعیاتی' حیاتیاتی اور نفسیاتی طبقوں سے تعلق رکھنے والے تمام سائنسی حقائق صرف اس وجدانی تصورِ حقیقت کے ساتھ پوری پوری مطابقت رکھتے ہیں جو قرآن حکیم پیدا کرتا ہے۔

اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ وہ غلط نظام ہائے حکمت یا فلسفے' جو غیر مسلم کو اسلام کی طرف آنے سے روکتے رہتے ہیں اور مسلمان معتقد کے اعتقاد کو خاموشی سے سلب کرتے رہتے ہیں' شکستہ ہو جائیں گے۔ سائنسی حقائق کو حمایت اور تائید اُن سے ہٹ کر اسلام کے لئے مہیا ہو جائے گی۔ لہٰذا یہ فلسفے یقین افروز نہیں رہیں گے اور بے اثر اور بے کار بھی ہو جائیں گے۔ اور ان کی بجائے ایک نیا صاف ستھرا صحیح معقول اور مدلّل فلسفہ' جو کلیتاً اسلام کا مؤیّد ہو گا بلکہ جو خود اسلام ہی کی ایک حکیمانہ اور سائنسی تشریح اور تفسیر ہو گا' وجود میں آئے گا۔ یہ ہے وہ طریق جس سے ہم دورِ حاضر کے علم کو قرآن کی روشنی میں اغلاط سے پاک کر سکتے ہیں۔ اور دنیا کے سامنے قطعی طور پر ثابت کر سکتے ہیں کہ صرف قرآن ہی کا عطا کیا ہوا تصور حقیقت صحیح ہے اور یہی ہے وہ طریق جس سے ہم غیر مسلم کو اس کی معلوم اور مسلّم صداقتوں یعنی سائنسی حقیقتوں سے استدلال کر کے اس کے نامعلوم حقائق یعنی قرآن حکیم کی صداقت کے یقین کی طرف لا سکتے ہیں اور شک کرنے والے مسلمان کو کفر اور الحاد سے بچا سکتے ہیں۔ اور پھر یہی ہے وہ طریق جس سے ہم اسلام کی وہ حکیمانہ اور

سائنسی توجیہہ وجود میں لاسکتے ہیں جس کے وجود میں آنے پر اس زمانہ میں ہماری زندگی کا دارومدار ہے۔

جب اسلام کی سائنسی توجیہہ' جو بیک وقت انسان اور کائنات کی سائنسی توجیہہ بھی ہوگی' فی الواقع وجود میں آجائے گی تو وہی ہمارے لئے انسانی اور اجتماعی علوم کی تشکیل جدید کی صحیح اساس بھی ہوگی۔ وہ ہمیں اس قابل بنائے گی کہ ہم مغربی حکماء کی ان کوششوں میں' کہ نام نہاد انسانی اور اجتماعی علوم کو سچ مچ کے علوم بنایا جائے' ان کی رہنمائی کر سکیں۔ اس راہنمائی کے نہ ہونے کی وجہ سے یہ کوششیں اب تک کامیاب نہیں ہو سکیں۔ اصل بات یہ ہے کہ جب تک ہمارے تحقیق اسلامی کے ادارے نفسیاتِ فرد اور نفسیاتِ جماعت اور سیاست' اخلاق' تعلیم' فن' اقتصادیات' قانون اور تاریخ کے فلسفوں کو از سرنو اسلام کے تصورِ حقیقت کی بنا پر اور اسلام کی ایک ہی ممکن سائنسی توجیہہ کے اجزاء اور عناصر کے طور پر مدوّن اور مرتب نہ کرلیں' یہ کہنا ہرگز ممکن نہ ہوگا کہ ان کا کام ابتدائی مرحلوں سے کچھ بھی آگے بڑھ سکا ہے۔ ظاہر ہے یہ کام اس نوعیت کا ہے کہ ایک درجن حکماء کو کئی سالوں تک مصروف رکھ سکتا ہے۔ اس سے معلوم ہو جاتا ہے کہ ہمارے تحقیق اسلامی کے اداروں کو جو کام درپیش ہے وہ کتنا وسیع و عریض ہے۔

ایک حیاتیاتی ضرورت

میں پھر اس بات کا اعادہ کرتا ہوں کہ اسلام کی حکیمانہ اور سائنسی توجیہہ مہیا کرنا مسلمانوں کی ایک حیاتیاتی ضرورت ہے' جس کو وہ صرف اپنی زندگی کی قیمت ادا کر کے ہی نظرانداز کر سکتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ حملہ یا جارحانہ اقدام بہترین مدافعت ہے۔ یہ حقیقت جس طرح اس جنگ کی صورت میں درست ہے جو ایک ریاست کو فوجی محاذ پر لڑنی پڑتی ہے اسی طرح سے اس جنگ کی صورت میں بھی درست ہے جو اس کو نظریاتی محاذ پر لڑنی ہوتی ہے۔ اگر ہم بروقت اور اس سے پہلے کہ پانی سر سے گزر جائے اسلام کی مدافعت کے لئے دوسرے نظریات کے خلاف علمی اور نظریاتی جہاد کا محاذ نہ کھول سکیں تو ممکن ہے کہ پھر اسلام کی مدافعت کا کوئی سوال ہی باقی نہ رہے اور ہم دیکھیں کہ جس نظریہ حیات کی مدافعت کے لئے ہم آخر کار باہر نکل رہے ہیں وہ وہ نہیں جس کی مدافعت کے لئے ہمیں

کل تک باہر نکلنے کے لئے کہا جاتا تھا۔ لیکن جب تک ہم اس طریق پر، جس کی نشاندہی اوپر کی گئی ہے، اسلام کی حکیمانہ اور سائنسی توجیہہ پیدا نہ کریں، ہم اس دور میں علمی اور نظریاتی جہاد کا محاذ نہیں کھول سکتے۔ کام کی فوری ضرورت اور اہمیت کے پیش نظر ہمیں اپنے بہترین اور سب سے زیادہ زوردار دماغوں کو اس کام پر لگانا چاہئے تاکہ یہ جلد از جلد اپنی تکمیل کے مرحلے طے کرے۔ ہمیں چاہئے کہ ہر پائی، جو میسر آسکتی ہے، اس کام پر لگا دیں اور جو لوگ اس کام میں لگ جائیں وہ جب تک کام ختم نہ ہو جائے پوری تندہی کے ساتھ اسی کام میں مصروف رہیں۔ میرا مطلب یہ نہیں کہ ہمیں مستشرقی تحقیق اور میکانکی اسلامی تحقیق کے کاموں کو کلیتاً بند کر دینا چاہئے، لیکن ہمیں یقیناً مستشرقی تحقیق کے کام کو، خواہ ہم آئندہ اس کو کسی نام کے ساتھ جاری رکھنا پسند کریں، یونیورسٹیوں تک محدود کر دینا چاہئے تاکہ اسلامی تحقیق کے غلط اور فریب کارانہ لقب کے ساتھ جو درحقیقت حیلہ ساز عیسائیت نواز مستشرقی ذہنوں کی پیداوار ہے وہ ہمارے اسلامی تحقیق کے اداروں میں دخل انداز نہ ہو سکے۔

میکانکی اسلامی تحقیق کا کام

باقی رہا میکانکی اسلامی تحقیق کا کام سو اسے کلیتاً اصلی اسلامی تحقیق کے کام کی ضرورتوں کے ماتحت رہنا چاہئے اور فقط ان فضلاء اور حکماء کی درخواست پر ہی انجام دینا چاہئے جو اصلی اسلامی تحقیق کے کام میں لگے ہوئے ہوں، تاکہ ان کی ضروریات کو، جو ان کے کام کے دوران میں وقتاً فوقتاً پیدا ہوتی رہیں، پورا کر سکے۔ البتہ ہم کو میکانکی اسلامی تحقیق کے کام کی طرف اس وقت بھی رجوع کرنا پڑے گا جب ہم اپنی مقدّس کتابوں یعنی قرآن اور حدیث کا یا ان کتابوں کا جو ان مقدّس کتابوں کی حکیماتی یا سائنسی توجیہہ پر مشتمل ہوں گی، اسلام کی عالمگیر اشاعت کے لئے دنیا کی دوسری زبانوں میں ترجمہ کرنے لگیں گے۔ لیکن یہ بات ہماری انتہائی کوتاہ نظری اور ذوقِ تقابل سے تہی دستی کا ثبوت ہوگی کہ ہم ایسے موقعہ پر بلا ضرورت میکانکی اسلامی تحقیق پر اپنا سارا وقت صرف کرتے رہیں جب کہ مقدس کتابوں پر خود ہمارا یقین ہی ختم ہو رہا ہے۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے کہ کوئی شخص ایک ڈوبتی ہوئی کشتی کے آخری بحرانی لمحوں میں کشتی کو بچانے کی

بجائے کشتی کی آنے والی تباہی سے بے پروا ہو کر اس کے مسافروں کی صحیح تعداد اور ان کے کپڑوں کی رنگت اور ساخت کی جزئیات اور تفصیلات کو ضبطِ تحریر میں لانے کے لئے بڑی کاوش کرتا رہے۔ یہاں تک کہ کشتی ڈوب جائے۔ قرآن حکیم کا ایک نہایت ہی عمدہ اشاریہ یا میکانکی اسلامی تحقیق کا کوئی ایسا ہی اور نتیجہ اس مسلمان کے لئے کسی کام کا نہیں جو اسلام پر اپنا یقین کھو چکا ہو' اگرچہ اسے وجود میں لانے کے لئے سال ہا سال کی محنت شاقہ بروئے کار لائی گئی ہو۔

مسلمانوں کی فوری ضرورت

بعض وقت کہا جاتا ہے کہ مسلمانوں کی فوری اور شدید ضرورت یہ ہے کہ اسلام کے جدید قانونی نظام کی تشکیل کی جائے۔ لیکن جب تک ہم اسلام کو ٹھیک طرح سے اور پوری طرح سے نہ سمجھ لیں ہم اسلام کے جدید قانونی نظام کی تشکیل کیسے کر سکتے ہیں۔ اس وقت ٹھیٹھ اسلام ہی کی مختلف توجیہات کی جا رہی ہیں۔ لہٰذا ہمیں پہلے یہ معلوم ہونا چاہئے کہ وہ کون سا اسلام ہے جس سے ہم نے ایک نیا قانونی نظام اخذ کرنا ہے' جب اسلام کی حکمیاتی اور سائنسی توجیہہ جو صرف ایک ہی ہو سکتی ہے' موجود ہو جائے گی تو پھر وہ نہ صرف غیر مسلموں کے تمام غلط نظریات اور فلسفوں کی مکمل اور ایمان پرور تردید کرے گی بلکہ اسلام کی اُن غلط اور بے بنیاد توجیہات کا بھی مکمل اور یقین افروز ابطال کرے گی جو ان مسلمانوں نے پیش کی ہیں جو اسلام کے جدیدیت زدہ کوتاہ اندیش مسلمان نکتہ چینوں کو مطمئن کرنے کے لئے اسلام کو ایک نئی شکل دینا چاہتے ہیں۔ لہٰذا اسلام کی حکمیاتی اور سائنسی توجیہہ کی فقط ایک ہی بنیاد ہے جس پر ہم اسلام کے جدید قانونی نظام کی عمارت کھڑی کر سکتے ہیں۔ اور اصل بات یہ ہے کہ جب اسلام کی ایسی توجیہہ فی الواقع وجود میں آئے گی تو ہم دیکھیں گے کہ احکامِ اسلام کی علتوں اور حکمتوں کے کھل جانے کی وجہ سے اسلام کے جدید قانونی نظام کی تشکیل کے بہت سے مشکل مسائل خود بخود حل ہو گئے ہیں اور اس کا سارا کام نہایت آسان ہو گیا ہے۔

ایک بے وقت کی کوشش

مسلمانوں کی زندگی کے اس مرحلہ پر' جب اسلام پر ان کا یقین گر رہا ہے' اسلام کے

قانونی نظام کی تشکیل جدید ایک بے وقت کی کوشش اور ایک بہت بڑی غلطی ہوگی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اسلام کے موجودہ قوانین بہتر نہیں بلکہ بدتر ہو جائیں گے۔ مجتہد کو جو چیز صحیح اجتہاد کے راستہ پر راہ نمائی کرتی ہے وہ علومِ قدیمہ وجدیدہ کا علم ہی نہیں بلکہ خدا کی محبت اور معرفت کا نور بھی ہے۔ انحطاطِ دین کے اس زمانہ میں یہ نور نایاب نہیں تو صَعْبُ الحُصُول ضرور ہے۔ اس سے پہلے کہ کسی مسلمان کے دل میں یہ نور پوری طرح سے روشن ہو نہ صرف یہ ضروری ہے کہ وہ عرصۂ دراز تک قرآن اور حدیث کے گہرے مطالعہ میں لگا رہے اور صحابہ رضی اللہ عنہم اور ائمہ اور صلحاء کی پاکیزہ اور مجاہدانہ زندگیوں سے اثر پذیر ہو بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ وہ اپنے آپ کو پوری طرح سے اسلام کے معاشرتی قوانین کو بدلنے کی فوری ضرورت ہے۔ لیکن جب تک ہم اسلام کے اخلاقی اور مذہبی ضبط کے ماتحت رکھے۔ کہا جاتا ہے کہ اُس وقت اسلام کے معاشرتی قوانین کو بدلنے کی فوری ضرورت ہے۔ لیکن جب تک ہم اسلام کے اخلاقی اور مذہبی قوانین کی خلاف ورزی کر رہے ہیں اس وقت تک ہم اسلام کے معاشرتی قوانین کی بھی کوئی عزت نہیں کر سکتے اور اس وقت تک ٹھیک طرح سے یہ بھی نہیں جان سکتے کہ ہمیں اسلام کے معاشرتی قوانین کو کس طرح بدلنا چاہئے اور آیا ان کو بدلنے کی ضرورت بھی ہے یا نہیں۔ ایسی حالت میں ہم اسلام کے معاشرتی قوانین کو کم از کم اسلام کے ان اخلاقی اور مذہبی قوانین کی روشنی میں نہیں بدل سکتے جن کی خلاف ورزی ہم دن رات کرتے رہتے ہیں۔

سچّا اجتہاد

سچّا اجتہاد ہمیشہ اسلام کی گہری محبّت کا نتیجہ ہوتا ہے اور اس محبّت کی وجہ سے وہ اس شریعت کی ایک قدرتی اور بے ساختہ نشوونما کی صورت اختیار کرتا ہے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ رضی اللہ عنہم نے ہمارے لئے چھوڑی ہے۔ اجتہاد کے لئے ہماری موجودہ خواہش اسلام کی محبت کا نتیجہ نہیں بلکہ اسلام کی پوشیدہ نفرت اور غیر اسلامی نظریات کی چھپی ہوئی محبت اور ستائش کا نتیجہ ہے۔ اس کا مقصد درحقیقت یہ ہے کہ اسلام کے احکام کو اس طرح سے بدل دیا جائے کہ وہ ہمارے ان خیالات اور تصورات کے ساتھ ہم آہنگ ہو جائیں جو ہم نے غیر اسلامی نظریات سے مستعار لئے ہیں اور جن کو ہم دل ہی دل میں چاہتے اور بنظرِ

استحسان دیکھتے ہیں۔ یہ خواہش دراصل اس بات کی ایک کوشش ہے کہ اسلام کو اس "حکمت" اور "دانائی" سے بہرہ ور کیا جائے جو ہم نے دوسرے نظریات سے سیکھی ہے۔ اور اس طرح سے اسلام کو ایک نئے "حسن و جمال اور ایک نئی شان و شوکت" سے، جن کا نظارہ ہم ان نظریات کی قیادت میں کر چکے ہیں، "مزیّن" کیا جائے۔ یہ سچّا اجتہاد نہیں، کیونکہ یہ وہ اجتہاد نہیں جو شریعت کی قدرتی اور بے ساختہ نشوونما کی صورت اختیار کرتا ہے، بلکہ یہ شریعت کی تحریف ہے جو ہم اپنے توہّمات کے زیر اثر کرنا چاہتے ہیں یا ایک ایسی کوشش ہے جس سے ہم دوسرے نظریات کو، جنہیں ہم پسند کرتے ہیں جہاں تک ہمارا بس چلتا ہے، اسلام کا مقام دینا چاہتے ہیں۔ سچّا اجتہاد اس وقت ممکن ہو گا جب ہم اسلام سے پھر ایسی ہی محبت کا احساس کرنے لگیں گے جیسی کہ پہلے ہمارے دلوں میں تھی۔ اور ہم اس شریعت کو جس پر حضور ﷺ اور صحابہ رضی اللہ عنہم کا عمل تھا پھر ایسی ہی محبت کی روشنی میں پوری طرح سے سمجھنے لگیں گے۔ جب تک ہمیں اسلام کی محبت کا یہ مقام پھر سے حاصل نہیں ہو جاتا ہم اسلام کی اس بصیرت سے محروم رہیں گے جس کی مدد سے ہم یہ سمجھنے کے قابل ہو سکتے ہیں کہ ہمارے معاشرہ میں جو تغیر واقع ہوا ہے وہ اس بات کا مقتضی ہے یا نہیں کہ ہم شریعت کی روشنی میں اس کی اصلاح کے لئے نئے قوانین وضع کریں۔ اگر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو یہ بصیرت حاصل تھی تو اس سے یہ کہاں ثابت ہو جاتا ہے کہ عام بے یقینی کے اس دور میں یہ بصیرت ہمیں بھی حاصل ہے۔ (جاری ہے)

ڈاکٹر اسرار احمد

کی تالیف

"استحکام پاکستان"

اس کتاب کا مطالعہ خود بھی کیجئے اور اسے زیادہ سے زیادہ عام کیجئے

شائع کردہ : **مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور**

مولانا ابوالکلام آزاد کی صحافت

عبدالرشید عراقی

مولانا ابوالکلام آزاد ایک نادر روزگار شخصیت کے مالک تھے۔ گوناگوں اوصاف اور محاسن کے حامل تھے۔ وہ جامع الکمالات تھے۔ وہ جید عالم دین تھے۔ امام و مجتہد تھے۔ وہ فطرتاً عبقری تھے۔ ان کی زندگی ایک فرد کی زندگی نہیں، پورے ایک عہد کی داستاں ہے۔ وہ میدان صحافت کے شہسوار تھے۔ ان کی صحافتی زندگی کی عمر تقریباً ۳۰ سال ہے۔ ۱۸۹۹ء تا ۱۹۲۷ء وہ صحافت سے وابستہ رہے۔ وہ صحافت کے میدان میں اس وقت داخل ہوئے جب حالی، شبلی اور نذیر احمد زندہ تھے۔

مولانا آزاد ۱۴ اخبارات و رسائل سے وابستہ رہے۔ ان میں کئی رسائل و جرائد کے مدیر رہے اور کئی اخبارات و رسائل میں مدیر معاون کی حیثیت سے خدمات سرانجام دیں۔ مولانا جن اخبارات اور رسائل سے وابستہ رہے، یہاں اس کی مختصر تفصیل پیش خدمت ہے۔

نیرنگ عالم

مولانا آزاد نے یہ ماہانہ رسالہ ۱۸۹۹ء میں کلکتہ سے جاری کیا۔ مولانا کی عمر اُس وقت ۱۳ برس کی تھی۔ نیرنگ عالم صرف شعری گلدستہ تھا جس میں نثر کا حصہ سرے سے تھا ہی نہیں۔ یہ رسالہ صرف آٹھ ماہ جاری رہا۔(۱)

المصباح

نیرنگ عالم کے بند ہو جانے کے بعد مولانا آزاد نے ۲۲ جنوری ۱۹۰۱ء کو کلکتہ سے ہفتہ وار ''المصباح'' جاری کیا۔ یہ اخبار مولانا آزاد نے مصر کے اخبار ''مصباح الشرق'' کی تقلید میں جاری کیا۔ یہ اخبار مذہبی نوعیت کا تھا۔ اس کے صرف تین چار شمارے شائع ہوئے۔(۲)

تحفہ محمدیہ

اس رسالہ کے بارے میں افضل حق قریشی صاحب اپنی کتاب ''ابوالکلام آزاد: ادبی و

شخصی مطالعہ'' کے صفحہ ۲۹ پر لکھتے ہیں کہ یہ کان پور سے شائع ہوتا تھا۔ جبکہ ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہان پوری اپنی کتاب ''مولانا ابوالکلام آزاد: ایک شخصیت، ایک مطالعہ'' کے صفحہ ۱۸۷ پر لکھتے ہیں کہ کلکتہ سے شائع ہوتا تھا۔ میرے خیال میں ڈاکٹر ابوسلمان کی رائے صحیح ہے۔

مولانا آزاد اس رسالہ کے بھی مدیر رہے اور یہ زمانہ ۱۹۰۱ء کا ہے۔

احسن الاخبار

یہ ہفتہ وار اخبار کلکتہ سے ۱۹۰۲ء میں جاری ہوا۔ مولانا آزاد اس کے مدیر مقرر ہوئے۔ اس اخبار کے بارے میں مولانا آزاد اپنے ایک مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں:

''اس اخبار کی اشاعت سے اس وقت مجھے بہت فائدہ ہوا۔ ایک تو قریبی مصرف طبع آزمائی پیدا ہونے کی وجہ سے ہر طرح کی مضامین نویسی کے لئے قومی تحریک وتشویق ہوئی، دوسرے اخبار کا ایک دفتر قائم ہو جانے کی وجہ سے تبادلے کے اخبارات و رسائل عام دیکھنے کا بہت اچھا موقع ملا۔''(۳)

خدنگِ نظر

اسی زمانے میں ۱۹۰۳ء میں منشی نوبت رائے لکھنو سے ماہنامہ ''خدنگ نظر'' نکالتے تھے۔ مولانا آزاد اُس میں اپنی غزلیں بھیجا کرتے تھے۔ اس کے حصہ نثر کی ادارت مولانا آزاد نے اپنے ذمہ لے لی۔ مولانا آزاد تحریر فرماتے ہیں:

''لکھنو سے نوبت رائے ''خدنگ نظر'' نکالتے تھے اس میں اپنی غزلیں بھیجا کرتا تھا۔ انہیں آمادہ کیا کہ نثر کا ایک حصہ بھی شامل کر دیں۔ اس کی ترتیب اپنے ذمہ لی''۔(۴)

ایڈورڈ گزٹ شاہجہان پور

۱۹۰۳ء میں مولانا آزاد نے ایڈورڈ گزٹ شاہجہان پور کی ادارت بھی اپنے ذمہ لی۔(۵) ڈاکٹر ابوسلمان صاحب لکھتے ہیں:

''مولانا آزاد کی احسن الاخبار، تحفہ محمدیہ اور خدنگ نظر (کے حصہ نثر) کی ادارت المصباح کے بعد کے واقعات ہیں''۔(۶)

لسان الصّدق

مولانا آزاد نے یہ ماہنامہ کلکتہ سے ۲۰ نومبر ۱۹۰۳ء کو جاری کیا اور یہ ۵ مئی ۱۹۰۵ء تک جاری رہا۔ یہ رسالہ اس وقت کے گئے چنے پرچوں میں ایک تھا۔ اس پرچہ میں کوئی نظم نہیں ہوتی تھی۔ پہلے شمارے میں اس کے جو مقاصد چھپے تھے وہ یہ تھے:

۱۔ سوشل ریفارم' یعنی مسلمانوں کی معاشرت اور رسومات کی اصلاح کرنا۔

۲۔ ترقی اردو' یعنی اردو زبان کے علمی لٹریچر کے دائرہ کو وسیع کرنا۔

۳۔ علمی مذاق کی اشاعت' بالخصوص بنگلہ میں۔

۴۔ تنقید' یعنی اردو تصنیفات پر منصفانہ ریویو۔

مولانا آزاد نے جب یہ رسالہ جاری کیا تھا اس وقت آپ کی عمر ۱۵ سال تھی۔

لسان الصدق کا معیار اتنا بلند تھا کہ اس کا شمار اس وقت کے صفِ اوّل کے رسائل میں ہونے لگا۔ اس کے مضامین پڑھنے سے قاری یہ محسوس کرتا تھا کہ اس کا مدیر ایک کہنہ مشق صحافی اور معمر آدمی ہے جس کا مطالعہ بہت وسیع ہے اور اس کو تمام علوم پر عبور حاصل ہے۔

اسی دوران انجمن حمایت اسلام لاہور کا سالانہ اجلاس منعقد ہوا۔ اس اجلاس میں مولانا ابوالکلام آزاد کو بھی شرکت کی دعوت دی گئی۔ مولانا حالی اور مولانا شبلی کو بھی اس اجلاس میں شرکت کی دعوت ملی تھی اور یہ دونوں بزرگ اس مقصد کے لئے لاہور تشریف لائے تھے۔ مولانا آزاد بھی اس اجلاس میں شرکت کے لئے لاہور تشریف لائے۔ لاہور میں ان کی ملاقات مولانا حالی اور مولانا شبلی سے ہوئی۔ اس ملاقات کی تفصیل مالک رام کی زبانی سنئے:

''مولانا آزاد انجمن کا اجلاس شروع ہونے سے ایک دن پہلے لاہور پہنچ گئے تھے۔ اسی دن ان کی ملاقات مولوی وحید الدین سلیم پانی پتی سے ہوئی۔ سلیم کو جب معلوم ہوا کہ یہی ''لسان الصدق'' کے مدیر شہیر ہیں تو انہوں نے باطور پر اسے عجائب عالم میں سے خیال کیا۔ وہ انہیں مولانا حالی کے پاس لے گئے، جو جلسے میں شرکت کے لئے آئے ہوئے دوسری جگہ کسی دوست کے ہاں مقیم تھے۔ جب سلیم مولانا آزاد کو ساتھ لئے پہنچے تو تعارف سے پہلے انہوں نے حالی سے پوچھا کہ آپ کے خیال میں ان کی عمر کیا ہوگی۔ حالی کی طبیعت کا حزم و احتیاط معلوم ہی ہے۔ انہوں نے تامل سے

جواب دیا: ابھی بہت کم سن ہیں۔ اس پر سلیم نے اصرار کیا کہ نہیں، فرمائیے آپ کے خیال میں کیا عمر ہوگی۔ بالآخر حالی نے کہا: یہی پندرہ سولہ سال کی ہوگی۔ اب سلیم نے انہیں بتایا کہ یہی ''لسان الصدق'' کے ایڈیٹر ہیں۔ یہ پرچہ مولانا حالی کی نظر سے بھی گزرتا تھا اور وہ اس کے مضامین کے مداح تھے۔ ساری دنیا کی طرح وہ بھی یہی گمان کرتے تھے کہ رسالے کے ایڈیٹر کوئی تجربہ کار عالم صحافی ہوں گے۔ یہ معلوم کر کے انہیں بہت تعجب ہوا کہ یہ نوعمر صاحبزادے اس ماہنامے کے ایڈیٹر ہیں۔ اس دن جو تعلقات دونوں میں قائم ہوئے، امتداد زمانہ سے ان میں استواری آئی اور ایک دوسرے کے متعلق عزت اور محبت کے جذبات میں اضافہ ہوتا گیا۔''(۷)

اسی اجلاس میں مولانا آزاد کی ملاقات مولانا شبلی نعمانی سے ہوئی تھی اور انہوں نے ان کو مولانا آزاد کا بیٹا سمجھا۔ جب انہیں بتایا گیا کہ یہی مولانا آزاد ایڈیٹر ''لسان الصدق'' ہیں تو بہت حیران ہوئے۔ فرمایا: ''ایسا نوعمر لڑکا اتنے اعلیٰ وارفع مضامین لسان الصدق میں لکھتا ہے۔ وقت آئے گا کہ اس کی ساری دنیا میں دھوم ہوگی۔''

مولانا شبلی کی یہ پیشین گوئی حرف بحرف صحیح ثابت ہوئی۔ مولانا ابوالکلام آزاد کا ساری دنیا میں شہرہ ہوا اور ان کے علمی تبحر اور جامع الکمالات ہونے کا اعتراف مشرقی ومغربی علمی و ادبی رہنماؤں نے کیا۔

لسان الصدق کو یہ شرف بھی حاصل تھا کہ اس میں لکھنے والے وہ حضرات شامل تھے جن کے مضامین دوسرے اخبارات ورسائل میں بہت کم شائع ہوتے تھے۔ وہ یہ حضرات تھے:

۱۔ شمس العلماء مولانا شبلی نعمانی
۲۔ شمس العلماء مولوی ذکاء اللہ دہلوی
۳۔ شمس العلماء مولوی محمد یوسف جعفری
۴۔ مولوی عبدالرزاق کان پوری مصنف ''البرامکہ''
۵۔ مولوی امجد علی اشہری
۶۔ مولوی عبدالحلیم شرر لکھنوی
۷۔ مولوی وحیدالدین سلیم پانی پتی

لسان الصدق صرف ۱۸ ماہ جاری رہا۔ اس کا آخری شمارہ اپریل مئی ۱۹۰۵ء کا مشترکہ شمارہ تھا۔

سہ روزہ وکیل

۱۹۰۵ء میں مولانا آزاد سہ روزہ وکیل امرتسر سے وابستہ ہو گئے۔ اس کے مالک شیخ غلام محمد تھے۔ مگر ۸ ماہ بعد آپ نے ادارت سے استعفاء دے دیا۔

الندوہ

ماہنامہ الندوہ لکھنؤ دارالعلوم ندوۃ العلماء کا علمی رسالہ اور اس کا نقیب تھا۔ یہ ایک نیم علمی یا نیم مذہبی رسالہ تھا' بلکہ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ تین چوتھائی علمی اور صرف ایک چوتھائی مذہبی تھا۔ اسے مولانا شبلی نعمانی نے اگست ۱۹۰۲ء میں جاری کیا اور اس کے ایڈیٹرز مولانا شبلی نعمانی اور مولانا حبیب الرحمان خان شیروانی مقرر ہوئے۔

مولانا شبلی اور مولانا ابوالکلام آزاد کے مابین خط و کتابت کا سلسلہ جاری تھا۔ مولانا شبلی نے مولانا آزاد کو لکھا کہ آپ الندوہ میں آ جائیں اور بطور مدیر معاون کام کریں۔ چنانچہ مولانا آزاد لکھنؤ چلے گئے اور الندوہ کے مدیر معاون مقرر ہوئے۔ الندوہ سے آپ کا تعلق اکتوبر ۱۹۰۵ء تا مارچ ۱۹۰۶ء تک رہا۔ ڈاکٹر محمد نعیم صدیقی ندوی لکھتے ہیں:

> ''اکتوبر ۱۹۰۵ء سے مارچ ۱۹۰۶ء تک مولانا ابوالکلام آزاد الندوہ کے سب ایڈیٹر رہے۔ الندوہ میں مولانا آزاد کا پہلا مضمون ''مسلمانوں کا ذخیرۂ علوم وادب'' اکتوبر ۱۹۰۵ء کے شمارے میں چھپا۔ اس کے بعد المرأۃ المسلمہ کے نام سے مصر کے قاسم بک اور فرید وجدی نے مسلمان عورتوں کی بے پردگی پر جو کچھ لکھا تھا اس پر مفصل و مدلل تبصرہ لکھا جو الندوہ میں بالاقساط عرصہ تک شائع ہوتا رہا۔ الندوہ کے مضامین نے پورے ملک میں ابوالکلام کے نام کا ایسا غلغلہ بلند کیا کہ دنیائے صحافت میں ہر طرف ان کی مانگ ہونے لگی۔''(۸)

سہ روزہ وکیل امرتسر

شیخ غلام محمد امرتسری مالک اخبار وکیل مولانا آزاد کے علمی تبحر سے واقف ہو چکے تھے۔ اس لئے وہ مولانا آزاد کو لکھتے رہتے تھے کہ آپ امرتسر آ جائیں اور اخبار وکیل کی ادارت سنبھال لیں۔ جب مولانا آزاد نے مارچ ۱۹۰۶ء میں الندوہ لکھنو سے علیحدگی اختیار کر لی تو

وہ شیخ غلام محمد کے اصرار پر اپریل ۱۹۰۶ء میں دوبارہ اخبار وکیل سے وابستہ ہو گئے اور نومبر ۱۹۰۶ء تک اس سے وابستہ رہے۔ اخبار وکیل سے علیحدگی کا سبب آپ کے بڑے بھائی ابونصر حسین آہ کا سانحہ ارتحال تھا۔ چنانچہ مولانا آزاد امرتسر سے کلکتہ تشریف لے گئے۔

دارالسلطنت کلکتہ

جب مولانا آزاد امرتسر سے کلکتہ تشریف لے گئے تو وہاں آپ کا قیام آٹھ ماہ رہا۔ اس عرصے کے دوران یعنی جنوری تا اگست ۱۹۰۷ء آپ ہفتہ وار دارالسلطنت کلکتہ کے مدیر رہے۔ دارالسلطنت سے علیحدگی کا سبب یہ ہوا کہ اخبار کے مالک عبداللطیف صاحب نے اخبار کی پالیسی میں عمل دخل شروع کر دیا، جو مولانا آزاد کے مزاج کے خلاف تھا۔ اس لئے مولانا آزاد نے اخبار دارالسلطنت سے علیحدگی اختیار کر لی۔

سہ روزہ وکیل امرتسر

اخبار دارالسلطنت کلکتہ سے علیحدگی کے بعد مولانا آزاد پھر اخبار وکیل امرتسر میں آ گئے اور اس کی ادارت سنبھالی۔ امداد صابری صاحب لکھتے ہیں:

> ''آٹھ نو ماہ بعد حضرت مولانا آزاد اخبار وکیل میں دوبارہ تشریف لائے۔ اتنے عرصہ میں بہت سی باتوں میں تغیر پیدا ہو چکا تھا اور تغیرات کا سلسلہ سرعت کے ساتھ جاری تھا۔ اس مرتبہ حضرت مولانا آزاد کے سیاسی خیالات خاص طور پر مسائل ہند کے متعلق کافی تبدیلی آ گئی تھی۔ حضرت مولانا آزاد کے دل و دماغ میں اخبار الہلال جاری کرنے کا خیال پیدا ہو چکا تھا۔''(۹)

مولانا آزاد اگست ۱۹۰۷ء میں اخبار وکیل سے وابستہ ہوئے تھے اور اگست ۱۹۰۸ء میں اپنے والد کی شدید بیماری کی بنا پر مستعفی ہو کر کلکتہ تشریف لے گئے۔ ۱۵ اگست ۱۹۰۸ء کو ان کے والد نے وفات پائی۔

الہلال

اخبار وکیل سے استعفاء اور والد کی وفات کے بعد ۱۹۰۹ء میں مولانا آزاد نے مغربی ایشیاء اور فرانس کا سفر کیا۔ مولانا مصر بھی تشریف لے گئے۔ وہاں آپ نے مفتی محمد عبدہ اور

علامہ جمال الدین افغانی کی تحریک کا مطالعہ کیا اور جب آپ واپس ہندوستان تشریف لائے تو ان کے افکار و خیالات اور تصورات کو اپنے ساتھ لائے۔ چنانچہ آپ نے مصمم ارادہ کر لیا کہ ''الہلال'' کے نام سے ایک اخبار جاری کریں گے۔

مولانا ابوالکلام آزاد نے ۱۳ جولائی ۱۹۱۲ء کو کلکتہ سے ہفت روزہ الہلال جاری کیا۔ الہلال مختلف حیثیتوں سے آزاد صحافت میں ایک نیا باب تھا۔ یہ اخبار صحیح معنوں میں ہندوستان کے مسلمانوں کی سیاسی، علمی، صحافتی اور ادبی تاریخ میں سنگ میل ثابت ہوا۔

''الہلال'' عصری صحافت میں محض ایک اخبار کا اضافہ نہ تھا بلکہ وہ اپنی ذات میں ایک مستقل تحریک تھا جس نے مسلمانوں کے بقاء و تحفظ میں کارہائے نمایاں سرانجام دیئے۔ الہلال ایک ''دعوت'' تھا جس کا مقصد دین الٰہی اسلام کی تجدید اور اس کے بنیادی اصول ''امر بالمعروف و نہی عن المنکر'' کو زندہ کرنا تھا۔

''الہلال''، محض ایک اخبار نہیں دراصل ایک صور قیامت تھا جس نے مُردہ دلوں میں ایک نئی جان ڈال دی اور جو شعلہ قیامت سرد ہو رہا تھا اس کو بھڑکا دیا۔ مولانا آزاد نے الہلال کے ذریعے کلمہ حق بلند کیا۔ جرأت، حق گوئی اور راست بازی کی وہ مثال قائم کی جو ہماری تاریخ کا ایک روشن باب ہے۔

ملت اسلامیہ خواب غفلت میں سو رہی تھی، الہلال نے اس کو بیدار کیا اور ملت اسلامیہ کے بیدار ہونے میں جو روکاٹیں تھیں الہلال نے اس کی نشاندہی کی۔ الہلال دراصل نالہ جرس تھا۔ لوگ آتے گئے اور کارواں بنتا گیا۔ الہلال مسلمانان ہند کی انقلابی سیاست کا آئینہ دار تھا اور مسلمانوں سے تعلق رکھنے والے ملکی اور بین الاقوامی امور کی آزاد ترجمانی کا شرف بھی اس کو حاصل تھا۔ الہلال کی شہرت و عظمت کا سہرا مولانا آزاد کی نابغہ شخصیت کے سر ہے۔ لیکن اس کے ادارہ تحریر میں جو مشاہیر اہل قلم شامل تھے، ان کی وجہ سے اس اخبار کی تحریکی اور دعوتی اہمیت کا غلغلہ پورے ہندوستان میں پھیلا۔

اس کے ادارہ تحریر میں مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا عبدالسلام ندوی، علامہ عبداللہ حمادی، عبدالواجد ندوی اور علامہ حامد علی صدیقی جیسے اہل علم و قلم شامل تھے۔

مولانا آزاد کی ادارت میں الہلال نے ہندوستان کے عوام کو انگریزوں کے خلاف

جدوجہد کی دعوت ہی نہیں دی تھی بلکہ انہیں یہ بھی بتایا کہ انگریز سامراج کے خلاف ان کی جدوجہد تمام آزادی پسند اقوام کی جدوجہد کا ایک جزو ہے۔ اس طرح الہلال نے ہندوستان کے مجاہدین آزادی کے ذہنی افق کو وسعت بخشی اور ان کے عزائم اور ارادوں کو پختگی دی۔

الہلال ۱۶ نومبر ۱۹۱۴ء تک جاری رہا۔ حکومت نے دس ہزار روپے کی ضمانت طلب کی جو جمع نہ کرائی جاسکی اور الہلال بند ہوگیا۔

البلاغ

الہلال کے بند ہونے کے ایک سال بعد مولانا آزاد نے ہفتہ وار البلاغ جاری کیا۔ اس کا پہلا شمارہ ۱۳ نومبر ۱۹۱۵ء کو شائع ہوا جبکہ آخری شمارہ ۱۷، ۲۴، ۳۱ مارچ ۱۹۱۶ء کی مشترکہ اشاعت تھی۔ یہ اخبار صرف پانچ ماہ جاری رہا۔

مولانا آزاد کو حکومت بنگال نے صوبہ بدر کر دیا جس کی وجہ سے البلاغ بند ہوگیا اور مولانا رانچی (بہار) تشریف لے گئے۔ الہلال کے مقابلے میں البلاغ کا انداز سیاسی سے زیادہ علمی تھا۔ نیاز فتح پوری نے الہلال اور البلاغ کا موازنہ ان الفاظ میں کیا ہے:

''الہلال کے بعد جب مولانا نے البلاغ جاری کیا تو اس کا نصب العین بھی وہی تھا جو الہلال کا تھا۔ لیکن طریق ابلاغ کچھ مختلف تھا۔ تیور وہی تھے لیکن رخ دوسرا تھا۔ انداز قد وہی تھا مگر لباس بدلا ہوا تھا۔ الہلال نفسیاتِ عملی کا درس تھا اور البلاغ نفسیات ذہنی کا۔ الہلال حرکت وعمل اور جوش و ولولہ کا پیام رساں تھا اور البلاغ فکر و بصیرت اور روحانی عزم و ثبات کا۔ الہلال کا پیام تھا:

''شیر شو شیرانہ در صحرائے شیراں جائے''

اور البلاغ کا:

''جلوہ بر خود کن وخود را بہ نگاہے دریاب''

الہلال خون منصور کی شعلہ آہنگی تھی اور دعوت دار و رسن جبکہ البلاغ بشارت روحانی تھی اور پیام طاغوت شکن۔ الہلال عرفی کی زبان میں نوید سرفروشی تھا کہ

برد پیالہ خونیں بجرز قصاباں
مشو گدائے شباناں کہ شیر می دوشند

اور البلاغ بیدل کی زبان میں پیام تھا ''خونے بہ جگر جمع کن و بروں آ'' کا۔ الہلال ایک کھلا ہوا چیلنج تھا' ایک بے باکانہ اعلان کہ ؎

نازک دلانِ باغ تو چوں شبنمِ سحر
بر روئے برگِ گل شکند آبگینہ ہا

اور البلاغ نہایت بلیغ درس تھا اس حقیقت کا کہ

دل گم گشتہ سراغے ست ز کیفیت شوق
نشہ بالا اگر دست رود شیشہ ما

بات وہی ایک تھی لیکن فرق صرف اتنا تھا کہ الہلال نے دامن کتاں چاک کیا اور البلاغ نے اس چاک سے نظارہ پرتو ماہ کی دعوت دی۔''(۱۰)

ہفت روزہ پیغام

جنوری ۱۹۲۰ء میں مولانا آزاد نظر بندی سے رہا ہوئے تو اس وقت ملک میں آزادی اور خلافت کی تحریکیں شروع ہو رہی تھیں۔ فروری میں بنگال پراونشل خلافت کانفرنس ہوئی جس کی صدارت مولانا آزاد نے کی' جس میں آپ نے ''مسئلہ خلافت اور جزیرۃ العرب'' کے عنوان سے خطبہ صدارت پڑھا، جو اس موضوع پر حرف آخر ہے۔ اس میں پہلے پہل مسلمانوں کو حکومت سے ترکِ موالات کی دعوت دی۔ پھر ہمہ تن اس تحریک کے لئے وقف ہو گئے۔ تحریک کی دعوت کے لئے اپنی نگرانی میں ہفت روزہ ''پیغام'' جاری کیا۔ اس کے ایڈیٹر مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی تھے۔ یہ اخبار بھی تقریباً ایک سال جاری رہا۔

الجامعہ

یکم اپریل ۱۹۳۳ء کو مولانا آزاد نے عرب دنیا کو تحریک آزادی سے روشناس کرانے کے لئے اپنی نگرانی میں پندرہ روزہ ''الجامعہ'' کلکتہ سے جاری کیا۔ اس کے ایڈیٹر بھی مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی تھے، لیکن زیادہ چیزیں مولانا ہی لکھواتے تھے۔

دوبارہ اجراء الہلال

۱۰ جون ۱۹۲۷ء کو مولانا آزاد نے دوبارہ الہلال جاری کیا۔ اس دور میں مولانا

عبدالرزاق ملیح آبادی ہی اس کے روح رواں تھے۔ مولانا نے اس میں پہلے ''الہلال'' کے طرز انشاء کی جادوگری چھوڑ دی۔ ۹ دسمبر ۱۹۲۷ء کو الہلال کا آخری شمارہ شائع ہوا اور اس کے بعد ہمیشہ کے لئے بند ہو گیا۔

الہلال اور البلاغ کے بارے میں سید سلیمان ندوی کی رائے

الہلال اور البلاغ کی خدمات کے بارے میں علامہ سید سلیمان ندوی فرماتے ہیں:

''اس میں کوئی شک نہیں کہ نوجوان مسلمانوں میں قرآن پاک کا ذوق مولانا ابوالکلام آزاد کے ''الہلال'' اور ''البلاغ'' نے پیدا کیا۔ جس اسلوبِ بلاغت، کمالِ انشاء پردازی اور زورِ تحریر کے ساتھ انہوں نے انگریزی خواں نوجوانوں کے سامنے قرآن پاک کی آیتوں کو پیش کیا، اس نے ان کے لئے ایمان و یقین کے نئے دروازے کھول دیئے اور ان کے دلوں میں قرآن پاک کے معانی و مطالب کی بلندی اور وسعت کو پوری طرح نمایاں کر دیا۔''(۱۱)

اس کے بعد مولانا آزاد ''ترجمان القرآن'' ''غبارِ خاطر'' اور ''کاروانِ خیال'' کی حیثیت سے جلوہ گر ہوئے۔ لیکن ان میں الہلال کا رنگ نہیں۔ پنڈت جواہر لعل نہرو نے کہا تھا: ''اگر مولانا نے اپنا قلمی جہاد جاری رکھا ہوتا تو آج ہماری قوم کو صاف اور سلجھے ہوئے طرز فکر اور صحیح راہ عمل کے تعین میں کس قدر گراں بہا تقویت نصیب ہوتی۔''

لیکن خود مولانا نے اپنی زندگی کا ماحصل ان الفاظ میں پیش کیا ہے: ''افسوس ہے کہ زمانہ میرے دماغ سے کام لینے کا کوئی سامان نہ کر سکا۔ غالب کو تو صرف اپنی ایک شاعری کا رونا تھا، معلوم نہیں میرے ساتھ قبر میں کیا کیا چیزیں جائیں گی۔ (۱۲)

ناروا بود بہ بازارِ جہاں جنسِ وفا
رونق گشتم و از طابع دکان رفتم

کتابیات

۱۔ آزاد کی کہانی، خود آزاد کی زبانی، ص ۲۲۷
۲۔ کچھ ابوالکلام کے بارے میں، ص ۵۴
۳۔ نقش آزاد

۴۔ امام الہند ابوالکلام آزاد از امداد صابری، ص ۵۷
۵۔ ابوالکلام آزاد از افضل حق قریشی، ص ۲۹
۶۔ مولانا ابوالکلام آزاد، ص ۱۸۷
۷۔ کچھ ابوالکلام کے بارے میں، ص ۵۵
۸۔ سید سلیمان ندوی: شخصیت و ادبی خدمات، ص ۳۲۴، ۳۲۵
۹۔ امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد، ص ۵۹
۱۰۔ ابوالکلام آزاد از افضل حق قریشی، ص ۳۰۷، ۳۰۸
۱۱۔ معارف اعظم گڑھ اکتوبر ۱۹۳۲
۱۲۔ مولانا ابوالکلام آزاد از ابوسلیمان شاہجہان پوری، ص ۱۸۱

ڈاکٹر اسرار احمد
کی
حد درجہ جامع تصنیف

نبی اکرم ﷺ کا مقصدِ بعثت

کا مطالعہ کیجیے

اعلیٰ سفید کاغذ ○ عمدہ طباعت ○ دیدہ زیب کتابت

مرکزی انجمن خدام القرآن ○ ۳۶۰ کے ماڈل ٹاؤن ○ لاہور

1924ء میں خلافت کی تنسیخ

کے بعد عالم اسلام میں جو مساعی کسی عالمی اسلامی ادارے کی تاسیس
کے ضمن میں ہوئیں ان کے بارے میں ایک نہایت وقیع تحقیقی مقالہ

جناب عمران این حسین

آف ٹرینیڈاڈ (ویسٹ انڈیز) نے ڈاکٹریٹ کے تھیسز کے طور پر بزبان
انگریزی تحریر فرمایا جو دو حصوں پر مشتمل تھا:

1- FROM ISTAMBUL TO RABAT

2- FROM RABAT TO LAHORE

اس مقالے کے حصہ اول کا ترجمہ (کسی قدر تلخیص کے ساتھ) چند سال قبل
مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور نے

استنبول سے رباط تک

کے عنوان سے شائع کیا تھا جس کا پہلا ایڈیشن بہت عرصہ قبل ختم ہو گیا تھا

اس کا نیا ایڈیشن شائع کر دیا گیا ہے

☆ کتابی سائز ☆ صفحات: 104 ☆ ہارڈ کور

قیمت : 35 روپے

(نوٹ: ان شاء اللہ اس تحقیقی مقالے کا دوسرا حصہ بھی ''رباط سے
لاہور تک'' کے عنوان سے جلد ہی شائع کر دیا جائے)